چاند شق ہو، ریڑ بولیں، جانور سجدہ کریں
بارک اللہ مرجع عالم یہی سرکار ہے
(حسن رضا)

تنقیدِ معجزات کا علمی محاسبہ

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

مصنف

مولانا محمد احمد مصباحی

(جامعہ اشرفیہ مبارک پور انڈیا)

النوریہ رضویہ پبلشنگ کمپنی

کچا رشید وڈ بلال گنج لاہور پاکستان

سلسلہ اشاعت نمبر ۸۴

تنقیدِ معجزات کا علمی محاسبہ

محمد احمد مصباحی

رکن المجمع الاسلامی — استاذ جامعہ اشرفیہ مبارک پور

النوریہ رضویہ پبلشنگ کمپنی

کچا رشید روڈ بلال گنج لاہور۔ پاکستان

+92 42 37247702

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کتاب ——— تنقیدِ معجزات کا علمی محاسبہ

تصنیف ——— مولانا محمد احمد مصباحی

تصحیح ——— محمد طالب مرادآبادی

اشاعتِ اوّل ——— ۱۴۲۲ھ / ۲۰۰۱ء مبارکپور انڈیا

اشاعتِ دوم ——— ۱۴۳۳ھ / ۲۰۱۲ء لاہور پاکستان

ناشرین ——— محمد مصطفیٰ اشرف / محمد مختار اشرف

بااہتمام ——— حاجی محفوظ احمد قادری مصطفوی

واحد تقسیم کار

دارُالنّور مرکز الاویس، دربار مارکیٹ، لاہور

042-37247702, 0300-8539972, 0314-4979792

حرفِ آغاز

۱۹۸۰ء کے دوران جب میں مدرسہ فیض العلوم محمد آباد گوہنہ ضلع اعظم گڑھ میں تدریسی خدمات انجام دے رہا تھا۔ علامہ یوسف بن اسماعیل نبہانی کی کتاب حجۃ اللہ علی العلمین فی معجزات سید المرسلین کا ترجمہ شروع کیا۔ یہ کتاب 20×30/8 سائز کے ایک ہزار سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۲۲۵ صفحات کا ترجمہ کر چکا تھا اور تبییض کر کے اسے طباعت کے لئے بھیجنا تھا مگر اس کے لئے ایک بسیط مقدمے کی ضرورت محسوس ہوئی جو اسی دوران لکھ ڈالا۔ کچھ تنقیدوں پر تفصیلی کلام اس خیال سے ترک کر دیا کہ حجۃ اللہ میں جہاں معجزات مذکور ہوں گے وہیں ترجمہ کے حاشیہ میں بحث کر دی جائے گی۔ مگر کچھ ایسے عوائق اور موانع درپیش ہوئے کہ نہ ترجمہ شائع ہو سکا نہ مقدمہ۔

ایک عرصے کے بعد یہ خیال ہوا کہ "مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ" کم از کم مقدمہ ہی شائع کر دیا جائے۔ اس کے کچھ اوراق ماہنامہ اشرفیہ مبارکپور کے بعض شماروں میں شائع ہو چکے ہیں۔ جس پر بعض احباب کے مسرت افزا خطوط بھی موصول ہوئے پھر بھی اشاعت میں تاخیر ہوتی گئی۔

اب امید رکھتا ہوں کہ رب تعالیٰ موانع سے بچاتے ہوئے جلد ہی اسے منظرِ عام پر آنے کے اسباب فراہم فرما کر مقبولِ خاص و عام بنائے گا۔ وما ذلک علیہ بعزیز

محمد احمد مصباحی

رکن المجمع الاسلامی

استاذ جامعہ اشرفیہ، مبارکپور

۲۵ ربیع الآخر ۱۴۱۵ھ

۲ اکتوبر ۱۹۹۴ء یکشنبہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
حامداً ومصلیاً

علماے اسلام نے سیرت نبوی کے ہر گوشہ پر اپنی بحث وتحقیق کے موتی لٹائے ہیں ان کی ان ہی عظیم خدمات کا ثمرہ ہے کہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ہر باب روشن و عیاں ہے۔ اور اہل نظر کو دعوتِ نظارہ دے رہا ہے۔ یہ بے داغ، بے عیب، صاف وشفاف سیرت اس قابل ہے کہ انسان اسے اپنا کر اپنی دنیوی واخروی زندگی سنوارے اور بلندیاں حاصل کرے۔ جو حیات اخروی سے ناآشنا اور اس کے یقین سے بے بہرہ ہیں وہ بھی اگر صرف اپنی دنیاوی زندگی کے لئے اس سیرت پاک کو دلیلِ راہ بنالیں تو اس کی کامیابی وبہتری کی ضمانت لی جاسکتی ہے۔ مگر حیات اخروی کا یقین وایمان حیات دنیوی کی سعادت سے کچھ اس قدر مربوط ہے کہ اس کے بغیر پورے طور پر دنیا کا سنورنا ممکن نہیں پھر بھی تاریخ شاہد ہے کہ اگر کسی قوم نے اپنی زندگی کے کسی شعبہ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیمات وہدایات اور سیرت مبارکہ سے اکتساب نور کیا تو وہ اس شعبہ میں چمک اٹھی۔ اور جہاں چھوڑا وہیں تاریکی میں پڑ گئی۔

معجزات کا باب بھی سیرت نبوی کا ایک جزء ہے اور اہم جزء ـــــ اس لئے بعض اکابر علما قدست اسرارہم نے خاص اس باب میں ضخیم کتابیں لکھیں اور اسے اسلام کی حقانیت کا روشن ثبوت قرار دیا۔ بعض کتب صحاح میں یہ باب ضمنی طور پر آگیا ہے جسمیں چند نمایاں اور مشہور معجزات کے بیان پر اکتفا کیا گیا ہے، کیوں کہ ان کتب حدیث کا اصل مقصد تالیف بہت وسیع اور چند در چند ابحاث وابواب کو حاوی ہے۔ معجزات کو آیاتِ نبوت، دلائل نبوت، اور اعلام نبوت یا علامات نبوت وغیرہ ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے ـــــ اس باب میں مستقل کتاب تالیف کرنے والوں کے پیش رو امام ابونعیم احمد بن عبداللہ اصفہانی

م/ ۴۳۰ھ جو نظر آتے ہیں۔ جن کی عظیم الشان کتاب دلائل النبوۃ کا کچھ حصہ ماضی قریب (۱۳۶۹ھ/۱۹۵۰ء) میں دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن سے شائع ہو چکا ہے۔ دوسرے خوش قسمت امام ابوالحسن علی بن محمد ماوردی شافعی (م/ ۴۵۰ھ) ہیں جن کی کتاب کا نام اعلام النبوۃ ہے۔ اور تیسرے جلیل الشان مصنف امام احمد بن حسین بیہقی (۳۸۴ھ/ ۴۵۸ھ) ہیں۔ امام بیہقی کی دلائل النبوۃ بے شمار خوبیوں کی حامل ہے۔ اس کی سندیں دوسری کتب دلائل کی بہ نسبت زیادہ معتمد ہیں اور بیشتر وہ ایک واقعہ کی متعدد سندیں ذکر فرماتے ہیں جس سے قوت واعتماد میں اور بھی اضافہ ہوتا ہے۔ ابن کثیر بعض مقامات پر ایک واقعہ سے متعلق بیہقی کی متعدد سندیں نقل کرتے ہیں جس سے اصل واقعہ کی تائید وتقویت ان کا مقصد ہوتا ہے۔ یہ بعض ناقدین کی خیانت ہے کہ وہ ایسے واقعات کا بھی انکار کرتے ہیں۔ جنہیں امام بیہقی نے متعدد سندوں سے ذکر کیا ہے۔ اور واقعات کی نامعتبری کے ثبوت میں دلائل بیہقی کی تمام سندوں کو پیش کر کے ان کا ضعف وسقم دکھانے کے بجائے ایک دو سندوں کی جرح پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ جس سے گمان ہوتا ہے کہ یہ واقعہ کسی قوی سند سے مروی ہی نہیں۔ بلکہ بعض اوقات یہ بھی ظاہر نہیں کرتے کہ اس کی متعدد سندیں ہیں۔ تاکہ کم از کم اصول حدیث سے آشنا حضرات ہی اس نتیجہ تک پہونچ سکیں کہ جب یہ واقعہ متعدد سندوں سے مروی ہے تو یقیناً معتبر ہے کیوں کہ تعدد سند سے حدیث قوی ہو جاتی ہے۔

دلائل بیہقی کے بارے میں مشہور عالم رجال، اور سخت ناقد حدیث امام ابوعبداللہ ذہبی فرماتے ہیں۔ علیك به فانه هدى ونور (زرقانی ج ۱ ص ۶۲) اسے لازماً اختیار کرو کیوں کہ یہ سراپا ہدایت اور نور ہے۔

امام بیہقی کے بعد دلائل ومعجزات کے باب میں مستقلاً اور ضمناً بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان ہی کتابوں میں علامہ یوسف بن اسمٰعیل نبہانی م/ ۱۳۵۰ھ کی جلیل الشان تالیف حجة الله على العلمين فى معجزات سيد المرسلين بھی ہے جس کے مصنف کی یہ خوش قسمتی ہے کہ ان سب یا ان میں سے بیشتر کتابوں سے استفادہ کا انہیں موقع ملا۔ اور بڑی وسعت نظر کے ساتھ اس خاص باب میں انہوں نے دوسری کتابوں میں منتشر اور مجتمع طور پر ذکر شدہ

معجزات کا بیشتر حصہ بڑے عمدہ نظم و ترتیب کے ساتھ یکجا کر دیا ہے۔

اس تصنیف کا مقصد اور اس کے مآخذ انہوں نے دیباچۂ کتاب میں بیان کر دیئے ہیں۔ ساتھ ہی پوری کتاب کی ترتیب بھی مقدمہ میں ذکر کر دی ہے۔ جس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ترتیب میں مصنف نے بڑی مہارت اور سلیقہ کا ثبوت دیا ہے۔ کتاب کا مقدمہ بھی چار اہم مباحث پر مشتمل ہے۔

مبحث اوّل

معجزہ کا معنیٰ، معجزہ اور دیگر خوارق عادات کا فرق۔

مبحث دوم

انبیائے سابقین کو جو بھی معجزہ ملا ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ معجزہ، یا اس کا مثل یا اس سے عظیم تر معجزہ ضرور ملا ۔۔۔ ہمارے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم انبیا کے نبی اور تخلیق میں سب سے مقدم بعثت میں سب سے مؤخر ہیں۔ تمام انبیا و مرسلین اپنے معجزات میں نور مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ہی مدد اور فیض طلب کرنے والے ہیں۔

مبحث سوم

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات تمام انبیائے کرام کے معجزات سے زیادہ روشن اور کثیر ہیں ساتھ ہی یہ خصوصیت بھی حاصل ہے کہ دیگر انبیا علیہم السلام کے معجزے ختم ہو گئے مگر ہمارے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعض معجزے ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

مبحث رابع

معجزات کی معرفت سے سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا یقین حاصل ہوتا ہے یعنی معجزات دلیل نبوت اور آیت رسالت ہیں۔ یہ بحث نہایت اہم ہے۔ اور اس تصنیف میں مصنف کا اصل مطمح نظر یہی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ جو لوگ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے دین حق کی تصدیق سے اب تک محروم ہیں وہ ان معجزات کو دیکھیں اور صاحب معجزات کی حقانیت کا یقین کریں، اور دولتِ ایمان سے شرفیاب ہو کر دنیا کے ساتھ آخرت کی ابدی زندگی سنواریں ۔۔۔ یہ عام مقصد تو ان لوگوں کے لئے ہے جو ابتک دولت ایمان سے سرفراز نہ ہو سکے۔ اور اہل سلام کے لئے یہ فائدہ ملحوظ

ہے کہ ان معجزات کے مطالعہ سے ان کے دلوں میں محبت رسول اور تعظیم رسول کا جذبہ فزوں تر ہو۔ خاتم النبیین سید الاولین والآخرین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ان کی وابستگی اور قلبی تعلق اس حد تک پہونچ جائے کہ محبوب کے اتباع پر ان کا دل خود بخود آمادہ ہو اور اس مسرت و سرخوشی کے ساتھ کہ جو اتنے اختیارات و تصرفات اور معجزات و آیات والا ہو کر بھی اپنے مولیٰ کی عبادت میں ہمہ وقت مشغول ہے اور خشیت ربانی اس کے دل پر حاوی ہے تو ہم گنہگاروں کے لئے عبادت رب اور خوف الٰہی کی کس قدر شدید ضرورت ہے ۔۔۔ درحقیقت تعظیم رسول اور حبِ رسول ہی وہ جذبہ ہے جس کے پیدا ہو جانے کے بعد عمل کی راہ نہایت آسان ہو جاتی ہے۔ ورنہ نفس سرکش کی شرارتوں سے کون واقف نہیں۔ حبِ رسول جب اس کے مکائد پر غالب ہوگی یقیناً حسنات و خیرات کے جلوے نمایاں ہوں گے، اور مرد مسلم کی زندگی قابل رشک ہو جائے گی۔۔۔

علامہ یوسف بن اسمٰعیل نبہانی کو یہ فخر حاصل ہے کہ باب معجزات میں اتنی جامع کتاب کی تصنیف میں وہ منفرد ہیں۔ اگرچہ ان کا ماخذ متقدم علما ہی کی تصانیف ہیں، مگر جامعیت اور حسن ایجاز میں اس کتاب کی انفرادیت سے انکار کی گنجائش نہیں۔ ایسا بھی نہیں کہ وہ بعض جدید سیرت نگاروں کی طرح معجزات اور تصرفات و اختیارات کو ہلکے پھلکے طور سے بیان کر کے گذر جاتے ہوں، نہیں بلکہ وہ جس معجزہ کو لیتے ہیں بہ تمام و کمال بیان کرتے ہیں تاکہ دلوں میں عظمت رسول کا چراغ روشن ہو۔ اور غیروں میں بھی تصدیق رسول کی تڑپ پیدا ہو۔ ان کا مقصد جدید مصنفین کی غرض سے اعظم و اعلیٰ اور ان کا یقین و ایمان ان کے اسلام سے کہیں زیادہ راسخ و قوی ہے۔ ان مصنفین کے دلوں کی صفائی اور ان کی نیک نیتی کو علامہ موصوف کے حسن اخلاق اور صفائے قلب و ارادہ سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ ۔۔۔ وہ ایجاز و اجمال کے موقع پر بھی تعظیم و اجلال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔

تعارف کتاب کا خاتمہ وہ ان الفاظ پر کرتے ہیں۔

فجاء ھذا الکتاب بحمد اللہ مجموعا جامعا ۔۔۔ ومولفا

بحمد اللہ یہ کتاب ایک جامع اور نفع بخش (اگر اللہ نے چاہا) تالیف کی صورت میں رونما

ان شاء الله نافعا ـــ لا اعلم كتابا
فی هذا الشان فی حجمه ـــ جامعا
لفوائده وعلمه ـــ وان كان نسبة
مافيه الى جميع معجزاته ـــ
ودلائل نبوته وآياته ـــ صلى
الله عليه وسلم نسبة الزهرة
الى الروض المعطار ـــ بل نسبة
القطرة الى البحر الزخار ـــ فأسأل
الله العظيم ـــ رب العرش الكريم
بجاه هذا النبى الكريم ـــ الرؤف
الرحيم ـــ ان يجعله عملا مقبولا
وبسعادة الدارين موصولا ـ وان
ينفع به نفعا عظيما ـــ ويهدى به
صراطا مستقيما ـــ

ہوئی اس موضوع پر اس ضخامت کی کوئی
کتاب اتنے فوائد وعلوم کی جامع میرے
علم میں نہیں اس کے باوجود اس میں ذکر شدہ
معجزات کو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے
تمام معجزات وآیات اور دلائلِ نبوت سے
وہی نسبت ہے جو ایک پھول کو عطر بیز
باغات سے، بلکہ قطرہ کو بحر زخار سے ہوتی
ہے تو عظمت والے خدا، عرش کریم کے
مالک سے اس نبی کریم کے رتبہ کے طفیل
سوال ہے کہ اسے عملِ مقبول بنادے اور
سعادتِ دارین سے مربوط کردے
اس سے عظیم نفع پہونچائے
اور اس کے ذریعہ سیدھی راہ کی
ہدایت فرمائے۔

ہمارے پیش نظر نسخہ خود حضرت مصنف قدس سرہ کے اہتمام وتصحیح سے شائع شدہ نسخہ کا عکس ہے جسے مکتبہ نوریہ رضویہ لائل پور نے شائع کرنے کی لائق تحسین سعادت حاصل کی ہے۔ مگر اصل میں جہاں مقام اشاعت اور مطبع کا نام تھا سب حذف کردیا ہے ـــ جس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ کب اور کہاں سے شائع ہوئی صفحہ ۸۸۰ وصفحہ ۸۸۱ سے معلوم ہوا کہ خود مصنف نے تصحیح فرمائی ہے۔ اور طباعت کی تکمیل بعہد سلطان غازی عبدالحمید خاں ثانی ذوالقعدہ ۱۳۱۷ھ میں ہوئی ہے ـــ اس کتاب کے سرورق پر خود مصنف کی مندرجہ ذیل تعارفی نظم طبع ہوئی ہے ـــ مصنف ہی کی نظم ہونا مکتبہ ایشیق استنبول کی شائع کردہ حجة الله على العلمين سے معلوم ہوا۔ مکتبہ ایشیق نے پوری کتاب شائع نہیں کی ہے بلکہ اس کے چند اوراق جن میں اہم معجزات وفضائل کا ذکر ہے وہی شائع کئے ہیں ـــ اس کے

سرورق کا نصف حصہ اصل کا عکس ہے اس میں تحریر ہے۔

تالیف مصححه الفقير يوسف بن اسمعيل النبهانی رئيس محكمة الحقوق فی بيروت القائل۔

القائل کے بعد (اس کا مقولہ یعنی) اس نظم کا عکس نہیں لیا گیا ہے۔ مگر مکتبہ نوریہ رضویہ نے اسے باقی رکھا ہے۔ نظم یہ ہے۔ اور کتاب کی عظمت شان سے آشنا کرنے کے لیے کافی ہے۔

كِتَابٌ تُسَمَّى حُجَّةَ اللهِ مَنْ وَّعٰى ـــ مُسَمَّاهُ فَهْمًا يُدْفِهِ طَابَقَ الاسْمَا

یہ حجۃ اللہ (اللہ کی دلیل) نامی کتاب ہے جو اسکے مضمون کو سمجھ کر یاد کرلے اسے اسم بامسمی (نام کے مطابق) پائے گا۔

اَتٰى جَامِعًا مِّنْ مُّعْجِزَاتِ مُحَمَّدٍ ـــ نَبِيِّ الْهُدٰى خَيْرِ الْوَرٰى عَدَّدَ الْحَصٰى

یہ نبیِ ہدایت، بہترین خلق محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے معجزات کی بھاری تعداد پر مشتمل ہوکر سامنے آئی۔

نُجُوْمٌ بِاُفُقِ الدِّيْنِ كَمْ اَهْتَدٰى بِهَا ـــ بَصِيْرٌ وَّكَمْ اَعْدٰى وَلَمْ يَرَهَا اَعْمٰى

یہ معجزات افق دین کے ستارے ہیں جن سے کتنے اہل بصارت کو ہدایت ملی اور کتنے نابینا انہیں دیکھ نہ سکے اور ہلاک ہوئے۔

وَمُعْجِزَةُ الْقُرْاٰنِ كَالشَّمْسِ اَشْرَقَتْ ـــ وَدَامَتْ وَصَارَتْ عَمَّتِ الْعُرْبَ وَالْعُجْمَا

اور معجزۂ قرآن تو آفتاب کی طرح درخشاں ہے۔ وہ دائمی اور سارے عرب وعجم کو عام ہے۔

وَرُبَّ امْرِئٍ مِّنْ نُوْرِهٖ مُتَضَرِّرٌ ـــ يَرَى الشِّرْكَ وَالْخُفَّاشُ تُعْجِبُهُ الظُّلَمَا

اور کسی کو اس کے نور سے تکلیف ہوتی ہے۔ وہ شرک سمجھتا ہے اور چمگادڑ کو تاریکیاں ہی پسند آتی ہے۔

وَوَاللهِ لَوْلَا اللهُ قَاضٍ عَلَى الْوَرٰى ـــ قَضَاءً بِعَدْلٍ وَّافِقَ الْقَدْرَ الْحَتْمَا

خدا کی قسم اگر حتمی تقدیر کے موافق عدل کے ساتھ مخلوق پر خدا کا فیصلہ نہ ہوچکا ہوتا۔

لَمَا اخْتَارَ ذُوْعَقْلٍ سِوٰی دِیْنِ اَحْمَدَ وَلٰکِنْ قَضَاءُ اللّٰہِ فِی خَلْقِہٖ تَمَّا

تو کوئی صاحب عقل دین احمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سوا کوئی دین اختیار نہ کرتا لیکن مخلوق میں تقدیر الٰہی تمام ہو چکی ہے۔ ــــــــ

مآخذ

اپنی کتاب کا ماخذ انہوں نے سیر و معجزات کی مستند کتب کو بنایا ہے۔ جا بجا کسی خاص موضوع پر لکھی ہوئی اکابر اسلام کی تحقیقی کتابوں سے استفادہ ہے۔ کئی اہم رسالے تو انہوں نے پورے پورے داخلِ کتاب کر دیئے ہیں دیباچہ کتاب میں اپنے اصل مآخذ حسب ذیل بیان فرمائے ہیں۔

(۱) دلائل النبوۃ ــــــ از امام ابو بکر بیہقی
(۲) " ــــــ " ابو نعیم اصفہانی
(۳) " ــــــ " ابو الشیخ اصفہانی
(۴) " ــــــ " ابو القاسم طبرانی
(۵) " ــــــ " ابو زرعہ رازی
(۶) " ــــــ " ابو بکر بن ابی الدنیا
(۷) " ــــــ " ابو اسحاق حربی
(۸) " ــــــ " ابو جعفر فریابی
(۹) " ــــــ " ابو عبد اللہ مقدسی
(۱۰) کتاب الوفا فی فضائل المصطفیٰ " حافظ ابو الفرج ابن الجوزی
(۱۱) شرف المصطفیٰ ۸ جلد ــــ ابو سعد نیشاپوری
(۱۲) اعلام النبوۃ ــــــ امام ابو الحسن ماوردی
(۱۳) الخصائص الکبریٰ ــــــ خاتمۃ الحفاظ جلال السیوطی
(۱۴) الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ ــ امام قاضی عیاض مالکی
(۱۵) المواہب اللدنیہ ــــــ امام شہاب الدین قسطلانی

(۱۶) السیرۃ النبویہ ــــــ علامہ سید احمد دحلان

دیگر معتبر و معتمد کتب۔ جن کی صراحت مقام اقتباس پر کر دی گئی ہے۔ نہایت نیک جذبات اور عظیم مشقت و محنت کے ساتھ ان بلند پایہ محدثین نے سیر و معجزات کے موضوع پر قلمی خدمات انجام دی ہیں۔ لیکن ایک طبقہ ایسا بھی ہے جس کے نزدیک یہ محدثین بہت بڑے مجرم ہیں۔ جرم کی اصل بنیاد صرف یہ ہے کہ انہوں نے تعظیم رسول کے جذبات کو فروغ دینے کا سامان فراہم کیا ہے۔ کمال یہ ہے کہ ان حضرات کو مجرم ثابت کرنے کے لئے ایسے ایک دلفریب دلیلوں کا اختراع کیا گیا ہے۔ عجب عجب کرشموں اور صریح کذب و دروغ تک سے کام لیا گیا ہے۔ ساتھ ہی علمائے امت کے مسلّمات اور مدلل اصولوں کو بھی ہدف تنقید بنانے میں ذہن و قلم کی پوری توانائیاں صرف کر دی گئی ہیں۔

چند نمونے آپ بھی ملاحظہ کریں ــ سلیمان ندوی، سیرۃ النبی جلد سوم میں رقمطراز ہیں۔

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کے متعلق جو جھوٹی اور بے سر و پا روایتیں مسلمانوں میں مشہور ہو گئی ہیں۔ یہ روایتیں زیادہ تر کتب دلائل میں ہیں یعنی ان کتابوں میں جنکو "لوگوں نے" عام حدیث کی کتابوں سے الگ کر کے صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کے ذکر و تفصیل میں لکھا ہے یہی کتابیں ہیں جنہوں نے معجزات کی جھوٹی اور غیر مستند روایتوں کا ایک انبار لگا دیا ہے۔ اور ان ہی سے میلاد و فضائل کی "تمام کتابوں" کا سرمایہ مہیا کیا گیا ہے [۱]

اس تمام ذخیرہ سے کتب صحاح اور خصوصاً بخاری و مسلم یکسر خالی ہیں [۲]

کتب دلائل کے ان مصنفین کا مقصد معجزات کی صحیح روایات کو یکجا کرنا نہیں۔ بلکہ کثرت سے عجیب و حیرت انگیز واقعات کا مواد فراہم کرنا تھا، تاکہ خاتم المرسلین کے فضائل و مناقب کے ابواب میں معتدبہ اضافہ ہو سکے [۳]

ہمارے ملک میں میلاد کی مجلسوں میں جو بیانات پڑھے جاتے ہیں وہ "تمام تر" ان ہی "بے بنیاد روایتوں سے" بھرے ہوتے ہیں [۴]

---

[۱] سلیمان ندوی، سیرۃ النبی سوم ص۔ ۲۰۷، طبع چہارم ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۸ء، معارف پریس اعظم گڑھ
[۲] ایضاً [۳] ایضاً ص ۲۱۷۔

ان بزرگوں (مصنفینِ کتبِ دلائل وفضائل) کے بذات خود معتبر اور مستند ہونے میں کسی کو کم کلام ہے۔ جو کچھ کلام ہے وہ اس میں ہے کہ انہوں نے ہر قسم کے راویوں سے ہر قسم کی روایتیں نقد اور تمیز کے بغیر اخذ کیں اور ان کو کتابوں کے اوراق میں مدوّن کر دیا۔ اور "تمام لوگوں نے" ان مصنفین کی عظمت اور جلالت کو دیکھ کر ان روایتوں کو قبول کر لیا۔ حالانکہ۔ ان میں نہ صرف ضعیف اور کمزور بلکہ موضوع حدیثیں تک موجود ہیں۔ اور ان کے سلسلۂ روایت میں ایسے راوی آتے ہیں جنکو محدثین کے دربار میں صفِ نعال میں بھی جگہ نہیں مل سکتی[1]

یہ روایات زیادہ تر تیسرے اور چوتھے درجے کی کتب حدیث میں پائی جاتی ہیں۔ تیسرے درجہ میں بقول شاہ ولی اللہ صاحب یہ کتابیں ہیں (کتابوں کے اسما کی تفصیل) اس تفصیل کے بعد شاہ صاحب فرماتے ہیں۔ صرف اول اور دوم درجہ کی کتابوں (یعنی صحاح ستہ) پر محدثین کا اعتماد ہے اور ان ہی پر ان کا مدار ہے۔ تیسرے طبقہ کی کتابوں سے وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو فن کے ناقد اور جوہری ہیں اور جنکو اسماء الرجال پر عبور اور علل حدیث سے واقفیت ہے۔ غرض جو صحیح اور غلط اور خطاء وصواب میں۔ امتیاز کامل رکھتے ہیں۔ چوتھے طبقہ کی کتابوں کو جمع وتدوین کرنا اور ان کو کام میں لانا متاخرین کی ایک قسم کی بے فائدہ کاوشِ فکر ہے۔[2]

دیکھا آپ نے! یہ اعتراف ہے کہ ان کتابوں کی تدوین سے ان محدثین کرام کا مقصد یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل ومناقب کے ابواب میں معتد بہ اضافہ ہو سکے پھر بھی وہ مجرم ہیں اور درحقیقت اُن کا بنیادی جرم یہی ہے جیسا کہ ہم اخیر میں واضح کریں گے باقی الزامات جو کچھ ان پر عائد کئے جا رہے ہیں ان کا تھوڑا سا تجزیہ ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) "یہی وہ کتابیں ہیں جنہوں نے معجزات کی جھوٹی اور غیر مستند روایتوں کا ایک انبار لگا دیا ہے"

[1] سلیمان ندوی، سیرۃ النبی سوم ص ۲۲۴، طبع چہارم معارف پریس اعظم گڑھ سنہ ۱۳۷۷ھ سنہ ۱۹۵۸ء
[2] ایضاً ص ۲۲۲، ۲۲۳۔

حقیقت یہ ہے کہ ان کتابوں میں ضعیف روایتوں کو تو ضرور جگہ دی گئی ہے مگر جھوٹی روایات تنقیح کے بعد بہت کم نکلیں گی اس کا ثبوت یہ ہے جیسا کہ انہوں نے خود تسلیم کیا ہے کہ "علامہ سیوطی نے مختلف دفتروں میں جو کچھ پھیلا تھا ان کو خصائص کی دو جلدوں میں یکجا کر دیا۔ تاہم مصنف کو یہ فخر ہے کہ ان کی کتاب موضوع اور بے سند روایتوں سے خالی ہے جیسا کہ دیباچہ میں انہوں نے خود ذکر فرمایا ہے"۔ ــــ

ضعیف روایتوں کو ذکر کرنے کی وجہ اگلی بحثوں سے واضح ہو جائیگی۔ کہ ضعاف باب فضائل میں بالاتفاق مقبول ہیں۔ ــــ

دوسری خاص چیز جس کے بیان سے مؤلف نے قصداً پہلو تہی کی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ان کتابوں میں صحیح ومستند روایتوں کا بھی ایک ضخیم دفتر موجود ہے۔ اور فضائل کی وہ تمام صحیح وحسن روایات جو صحاح ستہ میں متفرق طور پر مذکور ہیں۔ ان کتابوں میں بھی مسطور ہیں۔

(۲) "انہوں نے ہر قسم کے راویوں سے ہر قسم کی روایتیں نقد اور تمیز کے بغیر اخذ کیں اور ان کو کتابوں کے اوراق میں مدوّن کر دیا"ــــ

اس کا جواب خود مولف ہی کی تحریر سے واضح ہے، فرماتے ہیں:۔ ــــ

"ان مصنفین نے یہ سمجھ کر کے چونکہ ہر قسم کا سلسلۂ روایت لکھ دیا گیا ہے۔ اور لوگ اس سلسلۂ روایت کو دیکھ کر صحیح اور غلط، سچی اور جھوٹی روایت کا خود فیصلہ کر لیں گے ان روایتوں کی تدوین میں ضروری احتیاطیں مدنظر نہیں رکھیں"[1]

یقیناً ان کا زمانہ ایسی جہالت دنا آشنائی کا نہ تھا کہ عوام تو عوام علما تک کو رجال اور سلاسلِ روایت کی خبر نہ ہو۔ زیادہ تر کتب احادیث سے علما ہی کو شغف ہوتا تھا۔ اور وہ تنقید وتحقیق کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ پھر ان کتابوں میں بالعموم وہی روایتیں ہیں جو بالاتفاق باب فضائل میں مقبول ہیں۔ اگرچہ سیرۃ النبی کے مؤلف نے انہیں نامقبول ٹھہرانے

[1] سلیمان ندوی، سیرۃ النبی سوم ص ۲۲۴، طبع چہارم سنہ ۱۳۷۷ھ سنہ ۱۹۵۸ء، معارف پریس اعظم گڑھ

پر سارا زور قلم صرف کر دیا ہے۔ جس کا تجزیہ اگلے صفحات میں آرہا ہے۔ ——

(۳) " ہمارے ملک میں میلاد کی مجلسوں میں جو بیانات پڑھے جاتے ہیں وہ "تمام تر" ان ہی بے بنیاد روایتوں سے بھرے ہوتے ہیں" ——

یہ بالکل جھوٹ ہے اور محافل میلاد سے محض ذاتی عناد کی بنا پر اس جھوٹ کو روا رکھا گیا ہے قصہ گویوں کا تو کبھی اور کہیں بھی اعتبار نہیں۔ وہ ایسی روایات بھی بیان کر سکتے ہیں۔ جن کا کسی کتاب میں کوئی پتہ نہ ہو۔ لیکن بفضلہ تعالیٰ معتمد علما میلاد کی مجلسوں میں وہی روایات ذکر کرتے ہیں جو صحاح ستہ یا دوسری کتابوں میں قابل اعتبار سندوں کے ساتھ بیان کی گئی ہیں —— مولف کے دعوے کی تکذیب معمولی سمجھ والا آدمی بھی کر سکتا ہے کہ یہ تو ممکن ہی نہیں کہ مجالس میلاد کے "تمام تر بیانات" ان ہی بے بنیاد روایتوں سے "لبریز ہوں۔ جبکہ آئے دن عوام بخاری و مسلم اور دوسری کتابوں کی صحیح روایات ان ہی مجالس میں سنتے رہتے ہیں۔ ——

(۴) شاہ ولی اللہ صاحب کی تفصیل —— اور تیسرے طبقہ کی کتابوں کو صرف ناقدین کے لئے قابل استعمال بتانا، اور چوتھے طبقے کی ساری کتابوں کو بے فائدہ کاوش فکر کہنا شاہ صاحب کا یہ سارا بیان حجۃ اللہ البالغہ میں موجود ہے۔ وہی اس تقسیم کے موجد ہیں۔ ان سے پہلے کہیں اس کا پتہ نہیں۔ پھر بھی انہوں نے مسائل حلال و حرام اور احکام کے لئے مستند کتابوں کی یہ تقسیم و تفصیل کی ہے۔ اور ابتدا ہی اس سرخی سے کی ہے۔ کہ "احکام میں کون سی روایات و کتب قابل استعمال ہیں" ——

ظاہر ہے کہ احکام کا ماخذ اور ہوتا ہے فضائل کا اور —— چنانچہ یہی شاہ ولی اللہ صاحب اسی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں جہاں معجزات رسالت کا ذکر فرماتے ہیں وہاں بہت سے وہ معجزات بھی اعتبار کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ جو کتب دلائل میں ذکر ہوئے ہیں اس سے واضح ہوتا ہے کہ باب معجزات میں ان روایات کو وہ بھی قابل استناد سمجھتے ہیں۔

پھر جب انہوں نے ناقدین کے لئے تیسرے درجہ کی کتابوں کو قابل استعمال قرار دیا ہے تو بات ہی ختم ہو جاتی ہے۔ ان کتابوں سے استناد کرنے والے جاہل اور بے علم

لوگ نہیں۔ اعلیٰ درجہ کے محدثین ہیں۔ آج کے نام نہاد محققین جن کے مرتبۂ نقد و تنقیح اور احتیاط و ورع کی گرد پا کو بھی نہیں پا سکتے۔ امام احمد قسطلانی کا صرف یہی جرم ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل میں مواہب لدنیہ جیسی شہرۂ آفاق اور بلند پایہ کتاب لکھی۔ ورنہ وہ بخاری شریف کے شارح بھی ہیں۔ اور ان کی کتاب ارشاد الساری فی شرح البخاری ہر مکتب فکر کے علما کا ماخذ ہے۔ اسی طرح علامہ جلال الدین سیوطی کا جرم یہی ہے کہ انہوں نے خصائص نبوی میں الخصائص الکبریٰ لکھی۔ ورنہ ان کے جیسا عالم حدیث و رجال ان کے بعد روئے زمین پر پیدا نہیں ہوا۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں دلیل و ثبوت کے ساتھ "التعقبات علی الموضوعات" اور " اللآلی المصنوعہ فی الاحادیث الموضوعہ" میں انہوں نے علم و تحقیق کے وہ جوہر لٹائے ہیں۔ جو ان سے چار سو سال پہلے کے مشہور محدث اور زبردست مصنف علامہ ابن الجوزی پر ان کی فوقیت، حدیث میں دقت نظر، کتب حدیث پر وسعت نگاہ اور علمی و اصولی فیصلوں میں اعتدال و انصاف کی شہادت کے لئے سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ علامہ سیوطی نے اپنی تمام تصانیف میں یہی طرز تحقیق برقرار رکھا ہے ——

چوتھے درجہ کی کتابوں سے بھی ان محدثین نے استناد کر کے یہ واضح کر دیا ہے کہ یہ بے فائدہ کاوش فکر نہیں، بلکہ اہل علم و تحقیق کے لئے معارف کا گنجینہ ہے وہ محدثین تو بہت دور کے ہیں۔ خود امام احمد رضا فاضل بریلوی علیہ الرحمہ نے ان کتابوں سے باب احکام تک میں استناد کیا ہے۔ اس لئے کہ ان تصنیفات میں آثار و احادیث کی سندیں موجود ہیں اور ان سندوں سے باضابطہ اس بات کی تنقیح ہو جاتی ہے کہ کون سی روایت (صحیح لذاتہ یا صحیح لغیرہ، حسن لذاتہ، یا حسن لغیرہ ہونے کے باعث) احکام میں کار آمد ہے۔ اور کون سی روایت اس سے فروتر اور باب فضائل کے لئے قابل اعتماد ہے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب بھی اس تقسیم کے ناقل ہیں۔ اس کے باوجود تفسیر عزیزی اور تحفۂ اثنا عشریہ دیکھئے کہ خود انہوں نے تیسرے اور چوتھے طبقہ کی احادیث سے جا بجا استناد کیا ہے۔ اور اہل تحقیق ان علما کی تصانیف دیکھ کر بآسانی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ محدثین کی نیک کوششیں ہرگز رائیگاں نہ ہوئیں ——

⑤ " اس تمام ذخیرہ سے کتب صحاح اور خصوصاً بخاری و مسلم یکسر خالی ہیں"

یہ دعوی بھی لغو سا ہے۔ اور اس پر مبنی ہے کہ کتب دلائل میں صرف وہی روایات ہیں جو کتب صحاح میں نہیں۔ حالانکہ آنکھ والا دیکھ سکتا ہے کہ ان کتابوں میں کتب صحاح کی روایات بھی موجود ہیں۔ رہا یہ کہ بخاری و مسلم یا دیگر کتب صحاح میں بعض روایات نہیں۔ لہٰذا نا معتبر ہیں۔ یہ ایک مغالطہ ہے جو کم علم افراد کو دھوکا دینے کے لئے بڑے شدّومد کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ _____

لیکن جس نے سرسری طور پر بھی صحاح ستہ کا مطالعہ کیا ہے۔ نہیں بلکہ جس نے ان کتابوں کی صرف فہرست پر ایک نظر بھی ڈالی ہے۔ بلکہ جو ان کتابوں کے نام سمجھنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے وہ بھی یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ صحاح ستہ کا مقصد تالیف کیا تھا۔ پھر یہ بھی جان سکتا ہے کہ اگر ان کتابوں میں کتب دلائل کی ساری روایات جمع کی جاتیں تو پھر صحاح کا مقصد تالیف ہی دور جا پڑتا۔ _____

دیکھئے! نسائی، ابوداؤد، ابن ماجہ کے ناموں کے ساتھ سُنن لگا ہوا ہے۔ سنن میں روایاتِ احکام جمع کرنا مقصود اصلی ہوتا ہے، روایات مناقب و فضائل نہیں۔ بخاری و ترمذی پر جامع کی تعریف صادق آتی ہے۔ یعنی یہ ایسی کتابیں ہیں جن میں آٹھ ابواب ذکر ہیں۔ عقائد، احکام، تفسیر، سیر و مغازی، آداب، فتن، اشراط، مناقب مسلم میں جامع کے بعض ابواب مفقود ہیں۔ اس لئے وہ سنن سے کچھ زائد ہے۔ پھر مشاہدہ گواہ ہے کہ احادیثِ احکام و عقائد ان کتابوں میں بڑی تفصیل سے مرقوم ہیں کیونکہ ان مصنفین کا مقصود یہ تھا کہ لوگوں کے لئے ان احادیث کا ذخیرہ جمع کر دیں جو ان کے عقائد اور اعمال و عبادات کا ماخذ ہوں۔ تاکہ لوگ انہیں دلیل راہ اور مرجع عمل بنا سکیں، _____

اگر صحاح ستہ کے مصنفین کا یہ مقصد بھی ہوتا کہ ان کتابوں میں دلائل و معجزات کی تمام روایات یکجا کی جائیں اور وہ ان روایات کو نہ لاتے تو البتہ یہ شبہہ کیا جا سکتا تھا کہ شاید یہ تمام روایات ان کے نزدیک ناقابلِ اعتبار تھیں، یہ بھی شبہہ ہی ہوتا یقین نہیں! کیوں؟

اسکی وجہ آگے کے کلام سے ظاہر ہے _____

تہذیب الکمال، تہذیب التہذیب، میزان الاعتدال، تقریب وغیرہ تمام کتب رجال بلکہ بعض کتب اصول حدیث وغیرہ بھی دیکھ جائیے امام بخاری کے تذکرہ میں یہ ملے گا کہ انہیں ایک لاکھ صحیح احادیث یاد تھیں۔ جبکہ صحیح بخاری کی کل روایات چار ہزار سے زیادہ نہیں۔ تو کیا کوئی صاحبِ عقل یہ کہہ سکتا ہے کہ باقی تمام روایات ضعیف یا موضوع ہیں۔ آخر خود امام بخاری کی باقی چھیانوے ہزار صحیح احادیث کہاں ہیں؟ _____

امام احمد بن حنبل کے تذکرہ میں ملے گا کہ انہیں دس لاکھ حدیثیں یاد تھیں جبکہ ان کی مُسند کی تمام روایات لاکھ کو بھی نہیں پہونچتیں۔ بلکہ آدھ لاکھ بھی نہیں صرف تیس ہزار ہیں۔ تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ باقی ساری احادیث ضعیف ہیں۔؟ _____ درحقیقت یہ صرف ایک جاہلانہ مغالطہ ہے کہ جو احادیث صحاحِ ستہ میں ہیں وہ صحیح و معتبر۔ جو اُن میں نہیں ہیں نا معتبر۔ کیونکہ اگر معتبر ہوتیں تو ان کتابوں میں ضرور درج ہوتیں۔ _____

اعتبار و صحت کا دار و مدار صحاحِ ستہ میں مندرج ہونے نہ ہونے پر ہرگز نہیں۔ ترمذی، نسائی، ابوداؤد ابن ماجہ میں بھی صحیح و حسن حدیثوں کے ساتھ ضعیف روایتیں بھی موجود ہیں۔ بلکہ موضوع بھی ہیں، مُسلم کی بھی بعض حدیثوں کو ضعیف کہا گیا ہے۔ بخاری پر الزام ہے کہ اس کی بھی بعض حدیثیں ضعیف ہیں۔ اور بعض کے متعلق تو فیصلہ ہے کہ یقیناً ضعیف ہے بلکہ ابن حزم نے تو مُسلم کی ایک روایت کو موضوع بھی کہا ہے۔ _____

حضرت ابوسفیان کے اسلام لانے سے متعلق عکرمہ بن عمار سے مروی حدیث صحیح مسلم کے بارے میں ابن حزم نے کہا۔ هذا حديث موضوع لاشك في وضعه (مواہب ارواح القدس فی کشف حکم العرس ۱۳۲۴ھ از ملک العلماء مولانا ظفر الدین احمد قدس سرہٗ) مولوی محمد زکریا کاندھلوی شیخ الحدیث مظاہر العلوم سہارنپور نے اوجز المسالک الی مؤطا مالک میں ذکر کیا ہے کہ " واضح رہے کہ صحیح بخاری میں وہ حدیثیں بھی ہیں جو بالاتفاق صحیح ہیں اور بعض وہ جو بالاتفاق ضعیف ہیں اور بعض مختلف فیہ ہیں۔ یہاں تک کہ خود بخاری نے کتاب میں بعض احادیث کی نسبت تصریح فرمائی ہے کہ وہ صحیح نہیں پھر یہ دعویٰ

کیسے کیا جاتا ہے کہ بخاری کی ہر حدیث دوسری کتابوں کی حدیثوں سے صحیح تر ہے۔ لامحالہ بعض ان احادیث کی تخصیص کرنی ہوگی جو عنوانات ابواب میں نہیں۔ دار قطنی نے بخاری کی ایک ایک حدیث پر کلام تے ہوئے بہت سی احادیث پر اعتراض کیا ہے۔ اگرچہ صاحب فتح الباری نے مقدمہ صحیح میں اکثر کا جواب دیدیا ہے۔ لیکن مجبوراً انہیں بھی بعض احادیث کو ضعیف ماننا پڑا۔ اور انہوں نے انصاف فرمایا۔ [1] _____

مزید دیکھئے محقق علی الاطلاق ابن الہمام کمال الدین محمد بن عبدالواحد جو فقہ و حدیث کے مسلّم امام اور درجۂ اجتہاد کے قریب پہونچے ہوئے تھے۔ انہوں نے قبل مغرب دو رکعتوں کی ادائیگی سے متعلق حدیث بخاری کے معارض حضرت ابن عمر کی حدیث کے تحت گفتگو کرتے ہوئے اہم اصولی نکات پیش کئے ہیں۔ وہ اصحّ احادیث کی حسب ذیل تفصیل کو تحکم اور زبردستی کا فیصلہ قرار دیتے ہیں۔ _____

(۱) ساری احادیث سے زیادہ صحیح وہ حدیثیں ہیں جو بخاری و مسلم دونوں میں ہیں۔
(۲) پھر وہ جو صرف بخاری میں ہیں (۳) پھر وہ جو صرف مسلم میں ہیں۔
(۴) پھر دوسرے محدثین کی وہ احادیث جو بخاری و مسلم کی شرط پر ہیں۔
(۵) پھر وہ جو ان میں سے کسی ایک کی شرط پر ہیں۔ امام ابن الہمام فرماتے ہیں۔ اصح ہونے کی بنیاد یہی تو ہے کہ بخاری و مسلم کے راویان حدیث میں وہ شرطیں پائی جاتی ہیں۔ جن کا ان دونوں حضرات نے اعتبار کیا ہے۔ تو جب یہی شرطیں صحیحین کے علاوہ کسی اور حدیث کے راویوں میں بھی موجود ہوں اس وقت بھی صحیحین ہی کی حدیثوں کو اصح قرار دینا یقیناً ایک جبروتی حکم اور زبردستی کا فیصلہ ہے۔ _____

پھر کسی مخصوص راوی سے متعلق بخاری و مسلم دونوں بزرگوں یا ایک کی اگر یہ رائے ہے کہ وہ تمام شرطوں کا جامع ہے تو اس کا کیا یقین ہے کہ واقعتہً اس راوی میں ساری شرطیں موجود ہیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ واقعہ اس کے برخلاف ہو۔ اس کی شہادت یہ ہے کہ امام مسلم

[1] محمد زکریا کاندھلوی۔ اوجز المسالک الی موطا مالک، ص ۸۸۔ طبع ثانی ۱۳۸۶ھ مکتبہ یحییٰ سہارنپور

نے اپنی کتاب میں ایسے بہت سے راویوں کی حدیثیں درج کی ہیں جن پر سخت جرحیں موجود ہیں۔ اسی طرح راویان بخاری میں ایک جماعت ایسے لوگوں کی بھی ہے جن پر کلام کیا گیا ہے۔ _____

تو راویوں سے متعلق مدار کار علماء حدیث کے اجتہاد پر ہے (کسی نے اپنے اجتہاد کی رُو سے کسی راوی کو جرح سے محفوظ سمجھا ہے۔ اور دوسرے کے نزدیک وہ مجروح قرار پاتا ہے) یہی معاملہ شرطوں کا بھی ہے۔ _____

اس تنقید کے نتیجہ میں وہ فرماتے ہیں کہ اگر ایک محدث نے کسی شرط کا اعتبار کیا ہے اور دوسرے نے اسے لغو قرار دیا ہے تو دوسرے محدث کی وہ روایت جس میں ان کے نزدیک وہ شرط نہیں ہے اس شرط پر مشتمل روایت کے معارض ہونے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ اسی طرح کسی نے ایک راوی کو ضعیف قرار دیا ہے۔ اور دوسرے نے اُسے ثقہ مانا ہے۔ تو بھی یہی حکم ہوگا۔ _____

ہاں غیر مجتہد اور وہ شخص جسے خود راوی کے معاملہ کی تفتیش نہیں اس کے دل کو قرار اس سے ہوتا ہے جس پر اکثر کا اتفاق ہو۔ لیکن مجتہد اور ایسا شخص جو خود راوی سے باخبر ہے وہ تو شرط کے اعتبار اور عدم اعتبار میں اپنی ہی رائے کا پابند رہے گا _____

آگے تحریر فرماتے ہیں، کہ حسن و صحت اور ضعف کا فیصلہ سند کے لحاظ سے ظنی طور پر کیا جاتا ہے واقع کے لحاظ سے ہوسکتا ہے کہ صحیح غلط ہو اور ضعیف صحیح ہو۔ اسی لئے حدیث حسن سندوں کی کثرت کے باعث درجہ صحت تک ترقی کر جاتی ہے۔ اور ضعیف حجت ہوجاتی ہے۔ اس لئے کہ تعدد سند سے واقع میں اس حدیث کے ثابت ہونے کی تائید ہوتی ہے۔ پھر یہ کیوں نہیں ہوسکتا کہ صحیح سند والی حدیث کے خلاف کوئی ایسا قرینہ پایا جاتا ہو جس سے واقع میں اس حدیث کے ضعیف ہونے کا پتہ چلتا ہو اور اس کے مقابل حسن حدیث کے موافق کوئی ایسا قرینہ فراہم ہوتا ہو۔ جو اسے درجۂ صحیح تک پہونچا دیتا ہو۔ مثلاً ایک حدیث حسن کے موافق اکابر صحابہ کا عمل رہا ہے جو اس کی زبردست تائید فراہم کرتا ہے اور

دوسری حدیث صحیح پر صحابہ نے عمل ترک کیا ہے جو واقع میں اس کے ضعف کی نشاندہی کرتا ہے۔ اور یہاں یہی معاملہ ہے کہ مذکورہ حدیث بخاری پر صحابہ کا عمل نہیں اور حضرت عبداللہ بن عمر کی حدیث عمل صحابہ سے تائید یافتہ ہے [1]

مقصد گفتگو یہ ہے کہ صحاح ستہ میں کسی حدیث کا ذکر ہو جانا اس بات کی سند نہیں کہ وہ قطعاً صحیح ہے۔ ہاں ان کتابوں میں زیادہ تر صحیح و معتبر حدیثیں ہیں اسی لیے انہیں صحاح کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ شیخ محقق شاہ عبدالحق محدث دہلوی مقدمۂ اشعۃ اللمعات میں فرماتے ہیں۔

دریں کتب ستہ اقسام حدیث از صحاح وحسان وضعاف،
موجود است وتسمیۂ آں بصحاح ستہ بطریق تغلیب است

ان چھ کتابوں (بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ) میں صحیح، حسن، ضعیف ہر قسم کی حدیثیں ہیں اور انہیں صحاح ستہ اکثر و غالب کے اعتبار سے کہا جاتا ہے۔

یونہی صحاح ستہ میں کسی حدیث کا نہ ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ پایۂ اعتبار سے ساقط ہے بیشمار حدیثیں ایسی ہیں جو صحاح ستہ میں نہیں۔ مگر۔ صحیح ہیں، حسن ہیں معتبر ہیں۔ اور صحاح ستہ پر عمل کے لئے بھی خود صلاحیتِ نقد ہونا، یا معتمد ناقدین کے کلام کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔ جیسا کہ تیسرے اور چوتھے طبقہ کی کتابوں کے لئے یہی شرط ہے۔

اب اس تھوڑے سے تجزیے کے بعد ہمارا روئے سخن چند اصولی بحثوں کی طرف ہوتا ہے۔

---

[1] محمد بن عبدالواحد المعروف بابن الہمام م ۶۸۱ھ ج ۱/ص ۳۸۸، ۳۸۹ تلخیص۔

پہلی بحث

کس مسئلہ کے لئے کس درجہ کی حدیث درکار ہے

یہ ایک اہم بحث ہے۔ معاملہ کی نوعیت کے اعتبار سے دلیل کی نوعیت بھی بدل جاتی ہے۔ ہلال رمضان کے لئے ایک عادل مرد بلکہ مستور الحال غلام یا عورت کی شہادت بھی کافی ہوتی ہے۔ باقی گیارہ ہلالوں کے لئے دو عادل یا ایک عادل مرد اور ایسی ہی دو عورتوں کی شہادت ضروری ہوتی ہے۔ زنا کے الزام میں چار عینی عادل گواہ درکار ہوتے ہیں۔ عورتوں کے بعض معاملات میں ایک عورت کی گواہی بھی کافی ہوتی ہے۔ الغرض واقعہ کی نوعیت اور موقع و محل کے لحاظ سے ثبوت و دلیل کا درجہ بھی رکھا گیا ہے۔

احادیث و روایت کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔

(۱) اصول عقائد کے لئے قرآن کی نص قطعی یا ایسی حدیث متواتر ضروری ہوتی ہے جس کا معنی بالکل واضح ہو۔ کیوں کہ ان عقائد سے کسی کے کفر و اسلام کا فیصلہ ہوتا ہے۔ یعنی اگر کوئی ان عقائد ضروریہ کا منکر ہوگا تو اس پر کفر کا حکم عائد ہو جائے گا۔ حکم کفر تمام احکام سے زیادہ سخت ہے۔ اس لئے دلیل بھی ویسی ہی پختہ چاہئے۔

(۲) احکام و مسائل حلال و حرام کے لئے حدیث صحیح[1] یا حدیث حسن[2] کم از کم حسن لغیرہ[3] ضروری ہوتی ہے۔ کیونکہ ان احکام سے کسی کے

---

[1] صحیح وہ حدیث ہے جس کی سند متصل ہو اور اس کا ہر راوی عادل، حفظ و ضبط میں کامل ہو، علت اور شذوذ سے پاک ہو۔

[2] حسن جس کے راوی میں حفظ و ضبط کی کمی ہو اور صحیح کی باقی شرطیں موجود ہوں حدیث حسن اگر متعدد طرق سے مروی ہو تو صحیح لغیرہ ہو جاتی ہے۔

[3] حسن لغیرہ وہ حدیث ضعیف جو تعدد طرق سے قوت پا گئی ہو۔ ۱۲

صلاح و تقویٰ اور فسق کا فیصلہ ہوتا ہے۔ یعنی ان احادیث سے جن چیزوں کا فرض و واجب ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اگر کوئی ان پر پورے طور سے کاربند ہے تو صالح قرار دیا جائے گا۔ اور اگر کسی حرام کا مرتکب ہے یا کسی فرض کا تارک ہے یا کسی واجب کو بار بار چھوڑتا ہے۔ یا کسی گناہ صغیرہ پر اصرار کرتا ہے تو بلاشبہ فاسق قرار دیا جائے گا۔ مسلمانوں پر فسق کا حکم اگرچہ کفر کے حکم سے فروتر ہے پھر بھی اہمیت رکھتا ہے۔ اس لئے ایسے احکام کو ثابت کرنے والی احادیث کے لئے بھی یک گونہ شدت رکھی گئی ہے۔

(۳) کسی عمل کا جائز و مباح ہونا یا خوب و بہتر ہونا ثابت ہے۔ اب اس پر کوئی خاص ثواب ملنے کی بات ہے تو اس کے لئے ضعیف حدیث بھی کافی ہوتی ہے۔ یا کسی عمل کا ناجائز و حرام ہونا ثابت ہے۔ اب اس پر کسی خاص عذاب کا تذکرہ ہے تو اس کے لئے بھی حدیث ضعیف کافی ہے۔ یوں ہی کسی کی بزرگی و نیکی قوی دلائل سے ثابت ہو چکی ہے اب اس کے لئے کسی خاص فضیلت کا ذکر ہے تو یہاں بھی حدیث ضعیف مقبول و معتبر ہے۔ (البتہ موضوع کا کہیں گزر نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ وہ تو حدیث ہی نہیں کہ اس کا کہیں اعتبار ہو وہ تو کسی کی من گھڑت ہے کلام رسول نہیں، پھر مومن کا اس پر اعتماد کیوں کر ہو سکتا ہے) اسی کو اہل اصول فرماتے ہیں کہ فضائل اور ثواب و عذاب میں ضعاف کا بھی اعتبار ہے۔ عقل کا تقاضا اور روز مرہ بھی یہی ہے کہ اگر کوئی بزرگ صاحب صلاح و تقویٰ ہے جسے سب جانتے پہچانتے ہیں اس کے متعلق اگر کوئی شخص خبر دیتا ہے کہ میں نے فلاں رات اسے نوافل پڑھتے دیکھا ہے تو فوراً سننے والا اس کی بات پر اعتماد کر لیتا ہے۔ اگرچہ وہ خبر دینے والا فاسق و فاجر یا بے وقوف و نادان، یا کند ذہن اور مغفل قسم ہی کا کیوں نہ ہو۔ اس لئے کہ جس کے بارے میں یہ خبر ہے اس کا صلاح و تقویٰ اور عبادت گزار ہونا یوں ہی معروف و مسلم ہے۔

پہلی دونوں قسموں کی تفصیل سے مؤلف سیرت النبی کا کوئی اختلاف نظر نہیں

آتا لیکن قسم سوم میں حدیث ضعیف کے اعتبار سے انہیں شدید اختلاف ہے اگرچہ اس سلسلے میں فقہا و محدثین اور قابل ذکر علمائے اکابر میں سے کوئی ان کا پیشرو نہیں۔ ملاحظہ ہو ایک روایت کا تذکرہ کرتے ہوئے عجیب و غریب گل افشانی فرماتے ہیں۔

> محدث صابونی نے معجزہ کی ایک روایت لکھ کر پھر خود ہی اس پر جرح کی ہے کہ اس کی سند اور متن دونوں غریب بایں ہمہ وہ اس کے متعلق آخری رائے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ
>
> | | |
> |---|---|
> | ھو فی المعجزات حسن | معجزات میں وہ حسن (اچھی) ہے۔ |
>
> (زرقانی جلد ۱ ص ۱۷۲ و خصائص سیوطی جلد ۱ ص ۵۳)
>
> اس پر علامہ زرقانی شرح مواہب میں لکھتے ہیں کہ:
>
> | | |
> |---|---|
> | لأن عادۃ المحدثین التساھل فی غیر الأحکام والعقائد[1] (جلد ۱ ص ۱۷۲) | یہ اس لئے کہ محدثین کی عادت ہے کہ عقائد اور احکام کے علاوہ دیگر روایتوں میں وہ نرمی برتتے ہیں۔ |
>
> لیکن کیا یہ اصول صحیح ہے؟ اور من کذب علی متعمدا کی تہدید سے خالی ہے؟ معجزات ہوں یا فضائل ضروری ہے کہ آپ کی طرف جس چیز کی نسبت بھی کی جائے وہ شک و شبہ سے پاک ہو جیسا کہ امام نووی، حافظ عسقلانی، ابن جماعہ، طیبی، بلقینی اور علامہ عراقی نے اپنی اپنی تصنیفات میں اس کی تصریح کی ہے۔ (دیکھو

[1] زرقانی میں یہاں یہ لفظ بھی ہے، مالم یکن موضوعا۔ شرط یہ ہے کہ موضوع نہ ہو معلوم نہیں مزید اتنی عبارت نقل کر دینے سے مؤلف کا کتنا نقصان ہو جاتا، شاید یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ غیر احکام و عقائد میں صرف تساہل ہی تساہل محدثین کا وطیرہ ہے کسی چیز سے پرہیز کا خیال نہیں کرتے اور صحیح و غلط سب روا رکھتے ہیں، یا پھر یہ کہ آنجناب کے نزدیک ضعیف اور موضوع ایک ہی درجہ کی چیزیں ہیں، جیسا کہ ضعیف کے خلاف اُن کے بے پناہ شد و مد سے اندازہ ہوتا ہے ۱۲ محمد احمد

موضوعات ملا علی قاری ص ۹ مطبوعہ مجتبائی دہلی)

مؤلف کا یہی وہ نظریہ ہے جس پر ان کی تمام تر لایعنی بحثوں کا ہوائی محل تعمیر ہوا ہے۔ انہوں نے سوالیہ نشانات سے اپنا مدعا ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور صاف لفظوں میں یہ کہنے کی جسارت نہ ہو سکی کہ غیر احکام و عقائد میں موضوع چھوڑ کر ضعیف حدیثوں کا معتبر ماننا غلط ہے۔ اور جس نے بھی غیر احکام و عقائد میں حدیث ضعیف کا اعتبار کر لیا وہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تہدید من کذب علیّ معتمداً، فلیتبوّأ مقعدہ من النار (جس نے مجھ پر قصداً جھوٹ باندھا وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنائے) کا مورد بن گیا۔ اس لئے وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں تلاش کرے، صراحۃً یہ کہنے کی جسارت شاید اس لئے نہیں ہوئی کہ کوئی امام احمد بن حنبل سے لے کر علامہ زرقانی تک تمام محدثین و علماء، فقہاء کا استناد پیش کر کے یہ مواخذہ نہ کر دے کہ مؤلف نے ان سب کو جہنمی بنا دیا، اس لئے بات وہی کہی مگر دبی زبان سے ــــ اور سوالیہ انداز میں ــــ تاکہ عام قاری پڑھ کر گزر جائے اور یہ نہ سمجھ سکے کہ جناب والا ان دبے لفظوں میں کتنے جلیل القدر علمائے اُمت اور تمام اکابر ملت کو حدیث کا حوالہ دے کر گنہ گار و سیہ کار ٹھہرا رہے ہیں ــــ البتہ مثبت طریقہ پر یہ فرماتے ہیں اور بڑے دلفریب الفاظ میں فرماتے ہیں۔

"معجزات ہوں یا فضائل ضرور ہے کہ آپ کی طرف جس چیز کی نسبت بھی کی جائے وہ شک و شبہ سے پاک ہو"!

پتہ نہیں اس عبارت سے مؤلف کی اصل مراد کیا ہے؟ شک و شبہ سے پاک تو صرف حدیث متواتر ہوتی ہے دیکھئے نور الانوار میں منار کی عبارت۔

الکتاب ھو القرآن المنزل علی الرسول علیہ السلام، المکتوب فی المصاحف، المنقول عنہ نقلاً متواتراً بلا شبھۃ،

کے تحت یہ اظہار ہے کہ روایت مشہورہ میں بھی ایک طرح کا شبہ ہوتا ہے۔

معلوم ہوا کہ حدیث مشہور جس کا درجہ صحیح و حسن سے بہت اعلیٰ ہے اس میں

بھی شبہہ ہوتا ہے۔ قطعی یقین تو صرف اس روایت متواتر پر ہوتا ہے جسے ہر دور میں اتنے حضرات نے روایت کیا ہو جن کا جھوٹ پر اتفاق محال ہو۔ یہ استحالہ بھی بر بنائے عادت ہے، ورنہ امکان عقلی تو یہاں بھی ہوتا ہے ــــ

اب آپ بتائیے کہ دُنیا کے کسی عاقل نے بھی یہ شرط لگائی ہے کہ صرف وہی حدیث رسول مستند ہو سکتی ہے جو متواتر، قطعی و یقینی، شک و شبہہ سے پاک ہو۔ اگر ایسا ہو تو سُنن اربعہ (ترمذی، ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ) تو درکنار، بخاری و مسلم بھی پایۂ اعتبار سے ساقط ــــ اور دُنیا کی تمام کتب احادیث کو جمع کرنے کے بعد بھی صرف گنتی کی حدیثیں نکل سکیں گی جو معتبر ٹھہریں۔ باقی سارا دفتر احادیث بے کار اور ناقابل عمل ہو جائے گا۔ ہاں کچھ زائد مقدار میں احادیث مشہورہ نکل سکیں گی جن کے الفاظ و معنیٰ پر محدثین کا اتفاق ہو۔ مگر حدیث مشہور بھی محل شبہہ ہوتی ہے جبھی تو اس کے منکر کو کافر نہیں کہا جا سکتا۔ صرف گمراہ و بد دین ہونے کا حکم لگتا ہے۔

شاید یہ اپنی اصطلاح خاص میں شک و شبہہ کا معنیٰ کچھ اور رکھتے ہوں، یا صرف حدیث کے صحیح ہو جانے کو شک و شبہہ سے پاک ہونا مانتے ہوں، خیر یہ معنیٰ لے لیں تو غنیمت ہے اگرچہ عقل و نقل اصول و لغت کسی سے اس کی تائید نہ ہو۔ ابن الصلاح[1] نے مقدمہ میں تصریح فرمائی ہے کہ محدثین کے کسی حدیث کو صحیح کہنے کا مطلب یہی ہے کہ اس کی سند متصل ہے۔ اور وہ اوصاف خاصہ کی جامع ہے واقع میں اس کا قطعی و یقینی ہونا ضروری نہیں۔ صحیح ایسی حدیث بھی ہوتی ہے جس کا صرف ایک راوی ہو۔

ستم بالائے ستم یہ ہے کہ اپنے اس خود ساختہ نظریہ کا انتساب حیرت انگیز جسارت، اور صریح غلط بیانی کے ساتھ علمائے ثقات کی طرف فرماتے ہوئے

---

[1] مقدمہ ابن الصلاح فی علوم الحدیث از امام ابو عمرو عثمان بن عبد الرحمٰن شہرزوری معروف بابن الصلاح متوفی ۶۴۳ھ ص ۸ مطبوعہ بمبئی ۱۳۵۷ھ / ۱۲۴۴ء

لکھتے ہیں :

"جیسا کہ امام نووی، حافظ عسقلانی، ابن جماعۃ، طیبی، بلقینی اور علامہ عراقی نے اپنی اپنی تصنیفات میں اس کی تصریح کی ہے۔ (دیکھو موضوعات علی قاری ص ۹ مطبوعہ مجتبائی دہلی)"

ذرا ان کی عبارتیں پیش کی ہوتیں تو ہم بھی دیکھتے کہ ان میں سے کس عالم نے کس کتاب میں فرمایا ہے کہ "معجزات ہوں یا فضائل ضرور ہے کہ آپ کی طرف جس چیز کی نسبت بھی کی جائے وہ شک وشبہہ سے پاک ہو"

یا بالفاظ دیگر ان علما نے کس کتاب میں اور کہاں یہ لکھا ہے کہ "فضائل ہوں یا معجزات ضرور ہے کہ حدیث صحیح اور صرف صحیح یا حسن سے استناد کیا جائے"

موضوعات ملا علی قاری مطبوعہ مجتبائی دہلی ہمارے سامنے ہے صفحہ ۹ کی محولہ پوری عبارت نقل کی جاتی ہے۔ ذرا کوئی صاحب نظر ہمیں بھی دکھائے کہ کس لفظ سے یہ مدعا ثابت ہوتا ہے۔ مولانا علی قاری فرماتے ہیں۔

قال النووی فی شرح مسلم یحرم روایۃ الحدیث الموضوع علی من عرف کونہ موضوعا او غلب علی ظنہ وضعہ فمن روی حدیثا علم وضعہ او ظن وضعہ فھو مندرج فی الوعید، قال: ولا فرق فی تحریم الکذب علیہ علیہ السلام بین ما کان فی الاحکام وما لا حکم فیہ کالترغیب والترھیب والوعظ

امام نووی نے شرح مسلم میں فرمایا اس شخص پر موضوع حدیث کی روایت حرام ہے جو اس کے موضوع ہونے سے باخبر ہو یا اس کا ظن غالب ہو کہ وہ حدیث موضوع ہے۔ تو جس نے کوئی ایسی حدیث روایت کی جسے موضوع یقین کرتا ہو یا اسے موضوع سمجھتا ہو تو وہ بھی وعید میں شامل ہے۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنے کی حرمت میں احکام اور غیر احکام مثلاً ترغیب وترہیب اور وعظ وغیرہ اقسام

وغیر ذالک من انواع الکلام فکلہ حرام من اکبر الکبائر واقبح القبائح باجماع المسلمین الذین یعتد بھم فی الاجماع — الی ان قال وقد اجمع اھل الحل والعقد علی تحریم الکذب علی احاد الناس فکیف من قولہ شرع وکلامہ وحی والکذب علیہ کذب علیہ تعالیٰ۔ قال عز وعلا (وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی)

کلام کی کوئی تفریق نہیں۔ سب حرام ہے سب سے بڑے کبیرہ گناہوں اور سب سے بدترین برائیوں میں سے ہے، اس پر ان تمام مسلمانوں کا اجماع ہے جن کا اجماع میں اعتبار وشمار ہو سکتا ہے یہاں تک کہ مزید فرمایا۔ ارباب حل وعقد کا تو کسی بھی انسان پر جھوٹ باندھنے کی حرمت پر اجماع ہے، پھر اس ذات گرامی پر جھوٹ باندھنا کیسے حرام نہ ہو جس کا فرمان شریعت ہے اور جس کا کلام وحی اور جس پر دروغ باری تعالیٰ پر دروغ ہے۔ رب عزوجل نے فرمایا (وہ خواہش سے نہیں بولتے، وہ تو نہیں مگر وحی جو انہیں کی جاتی ہے۔)

قال الحافظ جلال الدین السیوطی رحمہ اللہ اتفق علماء الحدیث علی انہ لا یحل روایۃ الموضوع فی ای معنی کان الا مقرونا ببیان وضعہ بخلاف الضعیف فانہ یجوز روایتہ فی غیر الاحکام والعقائد قال ومن جزم بذالک النووی

حافظ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا علمائے حدیث اس بات پر متفق ہیں کہ کسی بھی مقصد ومطلب میں موضوع کی روایت کرنا جائز نہیں ہاں مگر یہ بتا کر کہ یہ موضوع ہے، بخلاف ضعیف حدیث کے کہ غیر احکام وعقائد میں اس کی روایت جائز ہے۔ علامہ سیوطی نے فرمایا۔ یہ قطعی فیصلہ کرنے والوں میں سے (کہ غیر احکام وعقائد میں

وابن جماعة والطيبي والبلقيني والعراقي۔ قلت وقد صرح به حافظ عصره العسقلاني في شرح نخبته۔

ضعیف حدیث کی روایت جائز ہے اور موضوع کی روایت وہاں بھی جائز نہیں) امام نووی، ابن جماعۃ، طیبی، بلقینی، اور عراقی ہیں (ملا علی قاری فرماتے ہیں) میں کہتا ہوں حافظ العصر علامہ عسقلانی نے بھی شرح نخبۃ الفکر میں اس کی صراحت کی ہے۔

دیکھئے کس لفظ سے ثابت ہوتا ہے کہ فضائل و معجزات میں حدیث ضعیف کا اعتبار نہیں، اور ایسی ہی حدیث ضروری ہے جو شک و شبہہ سے پاک ہو، جبکہ اس میں یہ صراحت موجود ہے کہ غیر احکام و عقائد میں حدیث ضعیف کی روایت درست ہے ـــــ ایسی دیدہ دلیری کے ساتھ اس قدر غلط حوالہ کسی محقق کی شان نہیں ـــ اس پر بھی غور فرمائیں کہ کیا یہ سارا بیان ذرا بھی اس کے مخالف ہے جو علامہ زرقانی نے فرمایا کہ :۔

عادة المحدثين التساهل في غير الاحكام والعقائد ما لم يكن موضوعا۔

محدثین کا طریقہ یہ ہے کہ وہ غیر احکام و عقائد میں نرمی برتتے ہیں بشرطیکہ موضوع نہ ہو۔

پھر بلا وجہ مؤلف سیرۃ النبی نے اس کی تردید کرتے ہوئے فرمایا :

"لیکن کیا یہ اصول صحیح ہے؟ اور "من کذب علی متعمدا" کی تہدید سے خالی ہے؟ معجزات ہوں یا فضائل ضرور ہے کہ آپ کی طرف جس چیز کی نسبت بھی کی جائے وہ شک و شبہہ سے پاک ہو جیسا کہ امام نووی، حافظ عسقلانی، ابن جماعۃ، طیبی، بلقینی اور علامہ عراقی نے اپنی اپنی تصنیفات میں اس کی تصریح کی ہے (دیکھو موضوعات ملا علی قاری ص ۹ مطبوعہ مجتبائی دہلی) [1]

[1] سید سلیمان ندوی سیرۃ النبی جلد سوم ص ۲۸۷ طبع چہارم ۱۳۷۷ھ ۱۹۵۸ء معارف پریس اعظم گڑھ۔

موضوعات ملا علی قاری میں ہے تو یہ ہے کہ "موضوع کی روایت بہرحال جائز نہیں، اور غیر احکام و عقائد میں حدیث ضعیف کی روایت درست ہے" ـــــ اب آپ بتائیے کہ جھوٹ، سفید جھوٹ اور بالکل غلط حوالہ آخر کس چیز کا نام ہے؟

علامہ نووی کی ساری تفصیل ان لوگوں کے خلاف ہے جو یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ وعظ و نصیحت اور ترغیب و ترہیب کے باب میں موضوع کی روایت روا ہے، ورنہ حدیث ضعیف کو تو غیر احکام و عقائد میں وہ خود معتبر مانتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مؤلف کو جب اپنے خود ساختہ نظریہ کے خلاف ہی خلاف اکابر امت کی متفقہ شہادتیں ملتی گئیں کہ "فضائل و معجزات، ترغیب و ترہیب وغیرہ (احکام و عقائد کے علاوہ) ابواب میں حدیث ضعیف معتبر اور مقبول ہے" تو مجبور ہو کر غلط اور جھوٹا حوالہ گڑھا اور یہ تاثر دینے کی کوشش فرمائی کہ ہم جو کہہ رہے ہیں یہ علماء ثقات بھی وہی فرما چکے ہیں۔

واقعہ یہی ہے کہ قرآن سے ثابت ہو چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سراپا "برہان" ہے۔

قد جاءكم برهان من ربكم وانزلنا اليكم نورا مبينا۔

تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے ایک برہان اور دلیل آئی اور ہم نے تمہاری طرف نور مبین اتارا۔

پھر احادیث صحیحہ صریحہ سے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بے شمار معجزات کا یقینی ثبوت فراہم ہوا یہاں تک کہ علماء نے معجزات رسول کو متواتر شمار کیا۔ اور انہیں سرکار کے صدق رسالت کی دلیل قطعی قرار دیا۔ تو جب سرکار کی فضیلت و برتری اور ان کا مصدر معجزات و آیات ہونا قطعی طور پر ثابت ہو چکا ہے تو اب اگر کسی حدیث ضعیف میں ملتا ہے کہ فلاں معجزہ بھی سرکار سے صادر ہوا تو عقل اسے مان لینے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کرتی، کہ جب اس قسم کے بلکہ اس سے بھی اعلیٰ و برتر معجزات اس ذات گرامی سے ثابت ہیں۔ تو ویسے

ہی یا اس سے آسان فلاں معجزہ کا صدور کیا بعید ہے؟ اسی طرح دیگر فضائل کو سمجھیں۔ اسی لئے یہاں حدیث کے حسن یا اس سے اعلیٰ درجہ کی ہرگز کوئی شرط نہ رکھی گئی"۔۔۔۔۔ (ہاں موضوع تو من گھڑت چیز ہے بارگاہ رسول کی جانب غلط اور جھوٹے انتساب کی گنجائش نہیں)۔۔۔۔۔

اب اگر کوئی کہے کہ نہیں صاحب! یہ تو بہت اہم بات ہے اس کے لئے تو ایسی ہی حدیث چاہئے جو شک وشبہہ سے پاک ہو، ایسی اعلیٰ روایت درکار ہے جو حسن ہو یا صحیح ہو، تو یہ اس کا اپنا قانون ہوگا۔ حدیث وشرع کا قانون نہ ہوگا، اس طرح خود ساختہ قوانین لاکر تو کوئی بھی حدیث و قرآن سب کو مسترد کرسکتا ہے مثلاً کوئی شخص یہ کہے کہ "حلال وحرام کے احکام کے لئے حدیث متواتر یا حدیث مشہور ضروری ہے۔ صرف صحیح ہونے سے کام نہ چلے گا، کیونکہ حلال وحرام کا معاملہ بہت اہم ہے ساری دنیا کے لوگوں کے اعمال واطوار کی جانچ اسی سے ہوتی ہے۔ یہ کیا کہ محض کسی حدیث صحیح میں آگیا کہ قعدۂ اخیرہ فرض ہے تو بس فرض ہوگیا۔ اس کے بغیر نماز ہو ہی نہیں سکتی کسی حدیث میں مل گیا کہ نماز میں گفتگو حرام ہے تو بس حرام ہوگئی۔۔۔۔۔ اب جہاں کسی نے دو لفظ کہے یہاں تک کہ کسی کے سلام کا جواب بھی دیا تو نماز چلی گئی۔ یوں ہی نکاح وطلاق، خرید وفروخت، اور تمام احکام فقہ بس ذرا ذرا باتوں پر جائز کا ناجائز۔ ناجائز کا جائز، مباح کا فرض، فرض کا مباح اور ثبوت میں صرف حدیث صحیح۔۔۔ ارے یہاں حدیث متواتر درکار ہے آحاد سے کام نہیں چلتا"۔۔۔۔۔

جب ندوی صاحب کو تمام محدثین کے خلاف، علما کے خلاف، ائمہ کے خلاف، عقل کے خلاف، نقل کے خلاف یہ قانون بنانے کی اجازت ہے کہ "نہیں جناب معجزات وفضائل کے لئے بھی حدیث صحیح ضروری ہے" تو اور کسی کو یہ قانون بنانے کی اجازت کیوں نہ ہوگی کہ "احکام کے لئے حدیث متواتر ہونے کی شرط ہے"۔۔۔۔۔

اب آپ بتایئے کہ ایسے قوانین وضع ہونے کے بعد تیسرے چوتھے درجہ کی کتابوں کی کوئی تخصیص رہ جائے گی؟ ساری کتب احادیث حتیٰ کہ بخاری ومسلم سب کی سب "خزف ریزوں کا ڈھیر" ہوجائیں گی اور نماز سے لے کر نکاح و طلاق خرید وفروخت، ولادت ونسب تک کسی حکم کی خیر نہ رہے گی!۔

فضائل ومواعظ وغیرہ میں حدیث ضعیف کا اعتبار ہے یہ اصول حدیث کے عام طلبہ سے بھی مخفی نہیں، مگر بدقسمتی سے ہمارا سابقہ ایسے طبقہ سے ہے جو جہل مرکب میں مبتلا ہے۔ اور اکابر امت سے ضد وعناد تو اس کا آبائی شیوہ ہے اس لئے معتمد ائمہ دین اور علمائے اصول سے چند نصوص یہاں نقل کئے جاتے ہیں تاکہ کم از کم اہل انصاف تو مطمئن رہیں۔

(۱) خطیب بغدادی جن کی کتب اصول بقول علامہ ابن نقطہ تمام علمائے مابعد کا مرجع وماخذ ہیں، وہ اپنی کتاب "الکفایہ" میں فرماتے ہیں۔

قد ورد عن غیر واحد من السلف انہ لا یجوز حمل الاحادیث المتعلقۃ بالتحلیل والتحریم الا عمن کان بریئا من التہمۃ بعیدا من الظنۃ واما احادیث الترغیب والترہیب ونحو ذالک فانہ یجوز کتبہا عن سائر المشایخ۔[1]

متعدد سلف سے منقول ہے کہ تحلیل وتحریم سے متعلق حدیثیں صرف اسی سے لی جائیں گی جو تہمت سے بری الزام سے دور ہو، لیکن ترغیب وترہیب وغیرہ کی احادیث جملہ مشائخ سے نقل کرنا جائز ہے۔

(۲) امام سفیان ثوری فرماتے ہیں:۔

لا تاخذوا ھذا العلم

حلال وحرام کے بارے میں یہ علم

---

[1] الکفایہ فی علم الروایۃ از خطیب بغدادی ابوبکر احمد بن علی متوفی ۴۶۳ھ ص ۱۲۸ دائرۃ المعارف حیدرآباد طبع دوم ۱۳۹۰ھ/۱۹۷۰ء۔

فی الحلال والحرام الامن الرؤساء المشهورین بالعلم الذین یعرفون الزیادۃ والنقصان فلا باس بما سوی ذالک [1]

صرف ان لوگوں سے حاصل کرو جو کمی بیشی سے واقف مشہور سرداران فن ہیں، البتہ ان کے ماسوا میں کوئی حرج نہیں۔

(۳) ابن عیینہ فرماتے ہیں :۔

لا تسمعوا من بقیۃ ما کان فی سنۃ واسمعوا منہ ما کان فی ثواب وغیرہ [2]

بقیہ (ایک راوی کا نام ہے) احکام کے بارے میں نہ سنو البتہ ثواب وغیرہ کے بارے میں سنو۔

(۴) امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں :۔

اذا روینا عن رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فی الحلال والحرام والسنن والاحکام شددنا فی الاسانید واذا روینا عن النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فی فضائل الاعمال ومالا یضع حکما ولا یرفعہ تساہلنا فی الاسانید [3]

جب ہم رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے حلال وحرام اور سنن واحکام کے متعلق روایت کرتے ہیں تو سندوں میں سختی برتتے ہیں۔ اور جب ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فضائل اعمال اور ان امور میں روایت کرتے ہیں جن میں کسی حکم کا اثبات یا نفی نہیں تو ہم سندوں میں نرمی اختیار کرتے ہیں

(۵) وہی فرماتے ہیں :۔

احادیث الرقاق یحتمل ان یتساہل فیہا حتی یجئ شی فیہ حکم [4]

رقاق (مواعظ و ترغیب وترہیب وغیرہ) کی حدیثوں میں نرمی کی جاسکتی ہے یہاں تک کہ حکم کی کوئی حدیث آئے (تو اس میں شدت ہوگی)

[1] ایضاً ص ۱۷۸ [2] ایضاً ص ۱۷۸ [3] ایضاً ص ۱۷۸ [4] ایضاً ص ۱۷۸

(۶) ابو زکریا عنبری فرماتے ہیں :۔

الخبر اذا ورد لم یحرم حلالا ولم یحل حراما ولم یوجب حکما وکان فی ترغیب او ترہیب او تشدید او ترخیص "وجب" الاغماض عنہ والتساہل فی روایتہ [1]

حدیث جب ایسی آئے کہ کسی حلال کو حرام، یا کسی حرام کو حلال نہ کرتی ہو، نہ کوئی حکم واجب کرتی ہو بلکہ ترغیب و ترہیب یا شدت ورخصت سے متعلق ہو تو "واجب" ہے کہ اس سے اغماض کیا جائے اور اسکے راویوں میں نرمی اختیار کی جائے

(۷) "علوم الحدیث" معروف بمقدمۃ ابن الصلاح اور "التقریب والتیسیر لمعرفۃ سنن البشیر والنذیر" معروف بہ تقریب امام نواوی اور جلال الدین سیوطی کی تدریب الراوی فی شرح تقریب النواوی میں ہے الفاظ تقریب وتدریب کے ہیں۔

(ویجوز عند اہل الحدیث وغیرہم التساہل فی الاسانید الضعیفۃ (ورواۃ ما سوی الموضوع من الضعیف والعمل بہ من غیر بیان ضعفہ فی غیر صفات اللہ تعالیٰ) وما یجوز ویستحیل علیہ وتفسیر کلامہ (والاحکام کالحلال والحرام وغیرہما وذالک کالقصص وفضائل الاعمال والمواعظ وغیرہما مما لا

محدثین اور دیگر علما کے نزدیک جائز ہے کہ ضعیف سندوں میں نرمی برتی جائے اور موضوع کے علاوہ ضعیف حدیثوں کی روایت بے اظہار ضعف بھی کی جائے جب کہ باری تعالیٰ کی صفات اور اس کے لئے ممکن و محال امور کے بارے میں (یعنی باب عقائد سے) نہ ہو اور اس کلام کی تفسیر اور احکام مثلاً حلال وحرام وغیرہ سے متعلق نہ ہو۔ اس کی مثال قصص ہیں۔ اور فضائل اعمال، مواعظ وغیرہ، امور جو عقائد واحکام سے متعلق نہیں۔ جن ائمہ سے یہ قاعدہ

[1] ایضاً کفایۃ ص ۱۷۹

تعلق لہ بالعقائد والاحکام) ومن نقل عنہ ذالک ابن حنبل وابن مہدی وابن المبارک قالو! اذا روینا فی الحلال والحرام شددنا واذا روینا فی الفضائل ونحوھا تساھلنا [1]

منقول ہے ان میں امام احمد بن حنبل امام ابن مہدی، امام ابن المبارک بھی ہیں، یہ حضرات فرماتے ہیں کہ جب ہم حلال و حرام میں روایت کرتے ہیں تو شدت برتتے ہیں اور جب فضائل وغیرہ میں روایت کرتے ہیں تو نرمی اختیار کرتے ہیں۔

(۸) موضوعات علامہ علی ابن سلطان محمد قاری رحمۃ اللہ علیہ کی مفصل عبارت گزر چکی۔

(۹) امام محمد بن عبدالباقی زرقانی شارح مواہب لدنیہ کی عبارت "عادۃ المحدثین التساھل فی غیر الاحکام والعقائد مالم یکن موضوعاً" گزر چکی۔

(۱۰) امام اجل شیخ العلماء والعارفین سیدی ابو طالب محمد بن علی مکی قدس سرہ اپنی عظیم الشان کتاب "قوت القلوب فی معاملۃ المحبوب" فصل ۳۱ میں فرماتے ہیں۔

الاحادیث فی فضائل الاعمال وتفضیل الاصحاب متقبلۃ محتملۃ علی کل حال مقاطیعھا ومراسیلھا لاتعارض ولاترد۔ کذالک کان السلف یفعلون۔

فضائل اعمال اور تفضیل صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی حدیثیں کیسی ہی ہوں ہر حال میں مقبول و ماخوذ ہیں مقطوع ہوں خواہ مرسل۔ نہ ان کی مخالفت کی جائے نہ انہیں رد کریں۔ ائمہ سلف کا یہی طریقہ تھا [2]

---

[1] تدریب الراوی شرح تقریب النواوی ص ۱۹۶ طبع اول ۱۳۷۹ھ/۱۹۵۹ء مطبوعہ مصر، مقدمہ ابن الصلاح از امام ابو عمرو عثمان بن عبدالرحمٰن شہرزوری معروف بہ ابن الصلاح متوفی ۶۴۳ھ/۱۲۴۴ء ص ۴۹ المطبعۃ القیمۃ بمبئی ۱۳۵۶ھ

[2] فتاوی رضویہ دوم ص ۴۰۷ از امام احمد رضا قادری بریلوی ۱۲۷۲ھ/۱۳۴۰ھ طبع دوم دہلی ۱۳۸۷ھ/۱۹۶۷ء۔

(۱۱) امام نووی اربعین میں۔ امام ابن حجر مکی شرح مشکوٰۃ میں، مولانا علی قاری مرقاۃ اور حرز ثمین شرح حصن حصین میں فرماتے ہیں۔

قد اتفق الحفاظ (ولفظ الاربعین) قد اتفق العلماء علی جواز العمل بالحدیث الضعیف فی فضائل الاعمال (ولفظ الحرز) جواز العمل بہ فی فضائل الاعمال بالاتفاق [1]

بے شک حفاظ حدیث اور علمائے دین کا اتفاق ہے کہ فضائل اعمال میں ضعیف حدیث پر عمل جائز ہے۔

(۱۲) فتح المبین بشرح الاربعین میں ہے۔

لانہ ان کان صحیحا فی نفس الامر فقد اعطی حقہ من العمل بہ۔ والا لم یترتب علی العمل بہ مفسدۃ تحلیل ولا تحریم ولا ضیاع حق الغیر۔ وفی حدیث ضعیف من بلغہ عنی ثواب عمل فعملہ حصل لہ اجرہ وان لم اکن قلتہ او کما قال۔ واشار المصنف رحمہ اللہ تعالیٰ بحکایۃ الاجماع

حدیث ضعیف پر فضائل اعمال میں عمل اس لیے ٹھیک ہے کہ اگر واقع میں صحیح ہوئی جب تو جو اس کا حق تھا کہ اس پر عمل کیا جائے (وہ) ادا ہوگیا۔ اور اگر صحیح نہ بھی ہو تو اس پر عمل کرنے میں کسی تحلیل یا تحریم یا کسی کی حق تلفی کا مفسدہ تو نہیں۔ اور ایک حدیث ضعیف میں آیا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جسے مجھ سے کسی عمل پر ثواب کی خبر پہنچی وہ اس پر عمل کرے اس کا اجر اسے حاصل ہو۔ اگرچہ وہ بات واقع میں، میں نے نہ فرمائی ہو۔ لفظ

---

[1] ص ۴۰۷ فتاوی رضویہ دوم۔

علی ماذکرہ الی الرد علی من نازع فیہ الخ۔

حدیث کے یوں ہی ہیں یا جس طرح حضور پر نور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمائے۔ امام نووی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس پر نقل اجماع علما سے اشارہ فرمایا کہ جو اس میں نزاع کرے اس کا قول مردود ہے[1]

حدیث ضعیف پر عمل مستحب ہے

امام احمد رضا قدس سرہٗ فرماتے ہیں "فضائل اعمال میں حدیث پر عمل نہ صرف جائز بلکہ مستحب ہے، حدیث ضعیف ثبوت استحباب کے لئے بس (کافی) ہے" دلیل میں معتمد علمائے دین کے یہ اقوال پیش کرتے ہیں۔

(۱) شیخ الاسلام ابو زکریا قدس سرہٗ "کتاب الاذکار المنتخب من کلام سید الابرار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں فرماتے ہیں۔

ترجمہ:۔ محدثین وفقہاء وغیرہم علما نے فرمایا کہ فضائل اور نیک بات کی ترغیب اور بری بات سے خوف دلانے میں حدیث ضعیف پر عمل جائز و مستحب ہے جبکہ موضوع نہ ہو۔

(۲و۳) بعینہا یہی الفاظ امام ابن الہمام نے "العقد النضید فی تحقیق کلمۃ التوحید" پھر عارف باللہ سیدی عبدالغنی نابلسی نے حدیقہ ندیہ شرح طریقہ محمدیہ (اواخر فصل ثانی از باب اول) میں فرمائے[2]

(۴) امام فقیہ النفس محقق علی الاطلاق فتح القدیر میں (قبیل فصل فی حمل الجنازہ) فرماتے ہیں:۔

الاستحباب یثبت حدیث ضعیف سے۔ کہ موضوع نہ

[1] ص ۴۰۷ فتاوی رضویہ دوم۔ [2] الحدیقۃ الندیہ فی شرح الطریقۃ المحمدیہ ج ۱ ص ۱۸۱ شائع کردہ مکتبہ نوریہ رضویہ لائل پور، عکس طبع ۱۳۹۰ھ۔

بالضعیف غیر الموضوع۔ ہو۔ فعل کا مستحب ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔

(۵تا۸) پھر اسی طرح علامہ ابراہیم حلبی کی "غنیۃ المستملی شرح منیۃ المصلی"۔ علامہ علی قاری کی موضوعات کبیر۔ علامہ جلال الدین سیوطی کی "طلوع الثریا باظہار ما کان خفیا"۔ علامہ محقق جلال الدین دوانی کی "انموذج العلوم" سے عبارات نقل فرمائی ہیں اور بحث و تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے[1]

ان تفصیلات سے روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ علمائے اسلام نے مقاصد کا لحاظ کرتے ہوئے اعتبار احادیث کی شرطیں رکھی ہیں (۱) عقائد کے لئے مشہور و متواتر (۲) احکام کے لئے صحیح یا حسن (۳) فضائل کے لیے ضعیف بھی کافی۔

موضوع کا کہیں کسی مقصد میں اعتبار نہیں اور قابل توجہ یہ امر ہے کہ اثبات فضائل کے لیے بھی حدیث ضعیف کو بے اعتبار سمجھنا اور اعلیٰ درجہ کی یعنی "صحیح ہونے کی شرط لگا لینا اصول و قواعد کے بالکل خلاف اور مسلمات کا انکار ہے۔ صحیح یا حسن ہونے کی شرط احکام اور مسائل حلال و حرام کے لئے ہے فضائل کے لئے نہیں۔

خود احادیث کریمہ سے ثابت کہ فضائل وغیرہ میں حدیث ضعیف معتبر ہے

جان برادر! اگر چشم بینا اور گوش شنوا ہے تو تصریحات علما درکنار خود حضور پر نور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے احادیث کثیرہ ارشاد فرماتی آئیں کہ ایسی جگہ حدیث ضعیف پر عمل کیا جائے اور تحقیق صحت و جودت سند میں تعمق و تدقیق راہ نہ پائے۔ بگوش ہوش سنیے اور الفاظ حدیث پر غور کرتے جائیے[2]

[1] فتاوی رضویہ دوم ص ۴۰۹ تا ۴۱۱۔

[2] امام احمد رضا قادری بریلوی:۔ فتاوی رضویہ دوم ص ۴۱۱ مطبوعہ دہلی۔

① حسن بن عرفہ اپنے جزو حدیث ـــــ اور ابو الشیخ مکارم الاخلاق میں سیدنا جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہما ـــــ ② ـ اور دار قطنی اور موہبی کتاب فضل العلم میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما ـ ③ ـــــ اور کامل جحدری اپنے نسخہ میں ـــــ اور عبداللہ بن محمد بغوی ان کے طریق سے ـــــ اور ابن حبان اور ابو عمر بن عبدالبر کتاب العلم ـ . اور ابو احمد بن عدی کامل میں سیدنا انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔

حضور سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم وعلیہم اجمعین فرماتے ہیں :۔

من بلغہ عن اللہ عزو جل شئ فیہ فضیلۃ فاخذ بہ ایمانا بہ ورجاء ثوابہ اعطاہ اللہ تعالیٰ ذالک وان لم یکن کذالک۔	جسے اللہ تبارک وتعالیٰ سے کسی بات میں کچھ فضیلت کی خبر پہنچے وہ اپنے یقین اور اس کے ثواب کی امید سے اس بات پر عمل کرے اللہ تعالیٰ اسے وہ فضیلت عطا فرمائے اگرچہ خبر ٹھیک نہ ہو۔

یہ لفظ حسن کے ہیں اور دار قطنی کی حدیث میں یوں ہے :۔

اعطاہ اللہ ذالک الثواب وان لم یکن ما بلغہ حقا۔	اللہ تعالیٰ اسے وہ ثواب عطا کرے اگرچہ وہ حدیث کہ اسے پہنچی، حق نہ ہو۔

ابن حبان کی حدیث میں یہ لفظ ہیں :۔

کان منی اولم یکن۔	چاہے وہ حدیث مجھ سے ہو یا نہ ہو۔

ابن عبدالبر کے الفاظ یوں ہیں :۔

وان کان الذی حدثہ کاذبا۔	اگرچہ اس حدیث کا راوی جھوٹا ہو۔

④ امام احمد وابن ماجہ وعقیلی سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی :۔ حضور پر نور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں :۔

ماجاءکم عنی من خیر قلتہ اولم اقلہ فانی اقولہ	تمہیں جس بھلائی کی مجھ سے خبر پہنچے خواہ وہ میں نے فرمائی ہو یا نہ فرمائی ہو میں اسے

وما جاءکم عنی من شر فانی لا اقول الشر۔	فرماتا ہوں اور جس بری بات کی خبر پہنچے تو میں بری بات نہیں فرماتا۔

وفی الباب عن ثوبان[۵] مولی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعن ابن عباس[۶] رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

⑦ ابو یعلیٰ اور طبرانی معجم اوسط میں سیدنا ابی حمزہ انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی : حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

من بلغہ عن اللہ تعالیٰ فضیلۃ فلم یصدق بھا لم ینلھا۔	جسے اللہ تعالیٰ سے کسی فضیلت کی خبر پہنچے وہ اسے نہ مانے اس فضل سے محروم رہے۔

ابو عمر ابن عبدالبر نے حدیث مذکور روایت کر کے فرمایا :۔

اھل الحدیث بجماعتھم یتساھلون فی الفضائل قبولھا عن کل، وانما یتشددون فی احادیث الاحکام [۱]	تمام علماء محدثین احادیث فضائل میں نرمی فرماتے ہیں۔ انہیں ہر شخص سے روایت کر لیتے ہیں ـــــ ہاں احادیث احکام میں سختی کرتے ہیں۔

خطیب بغدادی نے "الکفایہ فی علم الروایہ" میں بھی اس مضمون کی چند حدیثیں ان کی سندوں کے ساتھ ذکر کی ہیں[۲]

ان احادیث سے پتہ چلا کہ جسے اس قسم کی خبر پہنچی اور اس نے اس پر عمل کر لیا تو اپنے حسن نیت کے سبب وہ نفع ہی پائے گا۔ امام احمد رضا فرماتے ہیں : یعنی جب تک اس حدیث کا بطلان ظاہر نہ ہو کہ بعد ثبوت بطلان، رجا وامید کے کوئی معنی نہیں ـــــ فقول الحدیث "وان لم یکن ما بلغہ حقا" ونحوہ، انما یعنی بہ فی نفس الامر لا بعد العلم بہ۔ وھذا واضح جدا۔ فتثبت ولا

---

[۱] فتاوی رضویہ ج ۲ ص ۴۱۱ ـ ۴۱۲ ملخصا۔

[۲] ابو بکر احمد بن علی خطیب بغدادی : الکفایہ فی علم الروایہ ص ۵۷۴، ۵۷۵ مطبوعہ حیدر آباد ۱۳۹۰ھ/۱۹۷۰ء

تنزل۔

اور وجہ اس عطائے فضل کی نہایت ظاہر کہ حضرت حق عزوجل اپنے بندہ کے ساتھ اس کے گمان پر معاملہ فرماتا ہے۔ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنے رب عزوجل وعلا سے روایت فرماتے ہیں کہ مولیٰ سبحانہ تعالیٰ فرماتا ہے "انا عند ظن عبدی بی" میں اپنے بندہ کے ساتھ وہ کرتا ہوں جو بندہ مجھ سے گمان رکھتا ہے (بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ از حضرت ابوہریرہ والحاکم بمعناہ عن انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہما)

دوسری حدیث میں یہ ارشاد زائد ہے: فلیظن بی ماشاء۔ اب جیسا چاہے مجھ پر گمان کرے (اخرجہ الطبرانی فی الکبیر والحاکم عن واثلۃ بن الاسقع رضی اللہ تعالیٰ عنہ بسند صحیح) تیسری حدیث میں یوں زیادت ہے: ان ظن خیرا فلہ وان ظن شرا فلہ۔ اگر بھلا گمان کریگا تو اس کے لئے بھلائی ہے اور برا گمان کرے گا تو اس کے لئے برائی۔ (رواہ الامام احمد عن ابی ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بسند حسن علی الصحیح ونحوہ الطبرانی فی الاوسط وابو نعیم فی الحلیۃ عن واثلۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

جب اس نے اپنے صدق نیت سے اس پر عمل کیا اور رب عزجلالہ سے اس نفع کی امید رکھی تو مولیٰ تبارک وتعالیٰ اکرم الاکرمین ہے اس کی امید ضائع نہ کرے گا اگرچہ حدیث واقع میں کیسی ہی ہو۔ وللہ الحمد۔[1]

فضائل میں اعتبار ضعیف پر عقلی دلیل

ان نصوص ونقول کے علاوہ، عقل اگر سلیم ہو تو وہ خود بھی گواہ کافی ہے کہ ایسی جگہ ضعیف حدیث معتبر ہے کہ سند میں کتنے ہی نقصان ہوں آخر

[1] امام احمد رضا قادری۔ فتاوی رضویہ دوم ص ۴۱۲-۴۱۳ مطبوعہ دہلی

بطلان پر یقین تو نہیں ــــ فان الکذوب قد یصدق ــــ بڑا جھوٹا بھی کبھی سچ بولتا ہے۔ تو کیا معلوم کہ اس نے یہ حدیث ٹھیک ہی روایت کی ہو۔ اور جب صدق کا احتمال باقی تو عاقل جہاں نفع بے ضرر کی امید پاتا ہے اس فعل کو بجا لاتا ہے (اور فضائل رجال میں قبول کر کے سعادت حاصل کرتا ہے) دین و دنیا کے کام امید پر چلتے ہیں پھر سند میں نقصان دیکھ کر یک دست اس سے دست کش ہونا کس عقل کا مقتضیٰ ہے۔ کیا معلوم اگر وہ بات سچی تھی تو خود فضیلت سے محروم رہے اور جھوٹی ہو تو فعل میں اپنا کیا نقصان فافہم وتثبت ولا تکن من المتعصبین[1]

پھر کسی حدیث کو حسن یا صحیح یا ضعیف کہنا صرف سند کے لحاظ سے ظنی طور پر ہے واقع میں ہو سکتا ہے کہ صحیح غلط ہو اور ضعیف صحیح ہو[2]

یہی وجہ ہے کہ بہت احادیث جنہیں محدثین کرام اپنے طور پر ضعیف و نامعتبر ٹھہرا چکے۔ ائمہ عارفین سادات مکاشفین (قدس اللہ تعالیٰ باسرارہم الجلیلۃ ونور قلوبنا بانوارہم الجمیلۃ) انہیں مقبول و معتمد بتاتے ہیں اور قطعی و یقینی صیغوں سے حضور پر نور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف نسبت فرماتے ہیں۔ اور ان کے علاوہ بھی بہت سی تازہ احادیث ذکر کرتے ہیں جنہیں علما کتابوں اور دفاتر میں کہیں نہیں پاتے۔ ان کے ان ربانی علوم سے بجائے نفع اٹھانے کے بہت سے ظاہر بیں الٹے ان اولیائے کرام پر طعن شروع کرتے ہیں اور بلائے اہانت وغیبت میں گرفتار ہوتے ہیں۔ حالانکہ۔ العظمۃ للہ

[1] امام احمد رضا قادری۔ فتاوی رضویہ دوم ص ۴۱۳ تا ۴۱۶ ملخصا مطبوعہ دہلی۔

[2] مقدمہ ابن الصلاح۔ تقریب وتدریب۔ فتح القدیر۔ موضوعات کبیر۔

وہ بندگان خدا خوف الٰہی، معرفت خداوندی اور روایت حدیث رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام میں ان طعنہ کرنے والوں سے بدرجہا افضل و برتر تھے۔ ولکن :۔ کل حزب بمالدیھم فرحون ۔ وربک اعلم بالمھتدین [1]

میزان الشریعۃ الکبریٰ میں حدیث اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم (میرے صحابہ ستاروں کی طرح ہیں ان میں جس کی اقتدا کرلو راہ پاؤ) کی نسبت فرماتے ہیں :۔ اس حدیث میں اگرچہ محدثین کو کلام ہے مگر وہ اہل کشف کے نزدیک صحیح ہے [2]

اولیائے کرام کے پاس اس سند ظاہری کے علاوہ ایک دوسرا طریقہ ہے جو ارفع و اعلیٰ ہے۔ اس لئے سیدی ابو یزید بسطامی قدس سرہٗ اپنے زمانے کے منکرین سے فرماتے!

قد اخذتم علمکم میتا عن میت، واخذنا علمنا عن الحی الذی لایموت (نقلہ الامام الشعرانی) [3]	تم نے اپنا علم سلسلۂ اموات سے حاصل کیا ہے اور ہم نے اپنا علم حی لایموت سے لیا ہے۔

امام المکاشفین حضرت محی الدین ابن عربی قدس سرہٗ نے کچھ ایسی احادیث کی تصحیح فرمائی جو طریق علم پر ضعیف مانی گئی تھیں [4] اسی طرح خاتم الحفاظ امام جلیل جلال الملۃ والدین عبدالرحمٰن سیوطی قدس اللہ سرہ الکریم پچہتر بار بیداری میں حضور پرنور سید الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے جمال جہاں آرا کی زیارت سے بہرہ ور ہوئے۔ بالمشافہہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے تحقیقات حدیث کی دولت پائی۔ بہت احادیث کی جو طریقہ

---

[1] امام احمد رضا قادری :۔ فتاویٰ رضویہ ج ۲ ص ۱۴۴ ملخصاً و موضحاً۔

[2] میزان الشریعۃ الکبریٰ :۔ امام عبدالوہاب شعرانی ج ۱ ص ۲۸ مطبع حجازی قاہرہ ۱۳۵۴ھ

[3] الیواقیت والجواہر فی بیان عقائد الاکابر ۔ امام عبدالوہاب شعرانی مطبع حجازی قاہرہ ۱۳۵۴ھ

[4] فتوحات مکیہ ص ۴۳ ۔ الیواقیت وجواہر مبحث ۴۷ ص ۹ ج ۲ ۔

محدثین پر ضعیف ٹھہر چکی تھیں ۔ تصحیح فرمائی ۔ جس کا بیان عارف ربانی امام عبدالوہاب شعرانی قدس سرہٗ النورانی کی میزان الشریعۃ الکبریٰ میں ہے [1] من شاء فلیتشرف بمطالعتہ ۔

یہ نفیس و جلیل فائدہ جو بمناسبت مقام ۔ بحمداللہ تعالیٰ برادران دین کی نفع رسانی کے لئے حوالۂ قلم ہوا لوح دل پر نقش کرلینا چاہئے کہ اس کے جاننے والے کم ہیں اور اس لغزشگاہ میں پھسلنے والے بہت قدم [2]

خلیلی قسطاع الفیافی الی الحمی ۔ کثیر وارباب الوصول قلائل [3]

فوائد

(۱) ایک حدیث ضعیف میں بدھ کے دن پچھنے لگانے سے ممانعت آئی ہے کہ "جو بدھ یا ہفتہ کے روز پچھنے لگائے پھر اس کے بدن پر سفید داغ ہوجائے تو اپنے ہی آپ کو ملامت کرے"۔

ایک صاحب محمد بن جعفر بن مطر نیشاپوری کو فصد کی ضرورت تھی۔ بدھ کا دن تھا۔ خیال کیا کہ حدیث مذکور تو صحیح نہیں فصد لے لی فوراً برص ہوگئی۔ خواب میں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ حضور سے فریاد کی۔ سرکار نے فرمایا "ایاک والاستھانۃ بحدیثی"۔ خبردار میری حدیث کو ہلکا نہ سمجھنا۔ انہوں نے توبہ کی ۔ آنکھ کھلی تو اچھے تھے [4]

(۲) امام ابن عساکر روایت فرماتے ہیں۔ ابوالمعین حسین بن حسن طبری نے پچھنے لگانے چاہے ہفتہ کا دن تھا غلام سے کہا حجام کو بلا لاجب وہ چلا حدیث یاد آئی پھر کچھ سوچ کر کہا حدیث میں تو ضعف ہے غرض برص ہوگئی۔ خواب میں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے فریاد کی فرمایا۔

---

[1] میزان الشریعۃ الکبریٰ۔ امام عبدالوہاب شعرانی۔ ج ۱ ص ۱۴ مطبع حجازی قاہرہ ۱۳۵۴ھ ۱۹۳۶ء

[2] امام احمد رضا قادری۔ فتاویٰ رضویہ ج ۲ ص ۱۴۴۔ ۱۵ ملخصاً۔

[3] لآلی مصنوعہ :۔ امام سیوطی اواخر کتاب المرض والطب، تعقبات باب الجنائز۔

"ایاك والاستهانة بحدیثی" دیکھ میری حدیث کا معاملہ آسان نہ جاننا۔ انہوں نے منت مانی، اللہ تعالیٰ اس مرض سے نجات دے تو اب کبھی حدیث کے معاملہ میں سہل انگاری نہ کروں گا۔ صحیح ہو یا ضعیف۔ اللہ عزوجل نے شفا بخشی [1]

(۳) یوں ہی ایک حدیث ضعیف میں بدھ کے دن ناخن کتروانے کے متعلق آیا کہ باعث برص ہوتا ہے۔ ایک عالم نے کتروائے۔ کسی نے بربنائے حدیث منع کیا۔ فرمایا: حدیث صحیح نہیں ہے۔ فوراً مبتلا ہو گئے خواب میں زیارت محبوب ذی الجلال صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے مشرف ہوئے۔ شافی کافی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حضور اپنے حال کی شکایت کی۔ حضور والا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم نے نہ سنا تھا کہ ہم نے اس سے نہی فرمائی ہے۔ عرض کی حدیث میرے نزدیک صحت کو نہ پہنچی تھی۔ ارشاد ہوا تمہیں اتنا کافی تھا کہ حدیث ہمارے نام پاک سے تمہارے کان تک پہنچی۔ یہ فرما کر مبری الاکمہ والابرص ومحی الموتیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک ان کے بدن پر لگا دیا فوراً اچھے ہو گئے۔ اور اسی وقت توبہ کی کہ اب کبھی حدیث سن کر مخالفت نہ کروں گا [2]

یہ عالم امام علامہ ابن الحاج مکی مالکی قدس سرہٗ تھے۔ ان فوائد سے بحمداللہ تعالیٰ عقل سلیم کے نزدیک روشن ہو گیا کہ ضعیف حدیث اس کی غلطی واقعی کو مستلزم نہیں۔ دیکھو یہ حدیثیں بلحاظ سند کیسی ضعیف تھیں؟ مگر واقع میں ان کی وہ شان مخالفت کرتے ہی فوراً تصدیقیں ظاہر ہو گئیں۔

---

[1] لآلی مصنوعہ۔

[2] نسیم الریاض شرح شفاء۔ امام قاضی عیاض۔

کاش منکرانِ فضائل کو بھی اللہ عزوجل تعظیمِ حدیث مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی توفیق بخشے اور اسے ہلکا سمجھنے سے نجات دے [1]

دوسری بحث

مگر یہ مؤلفِ سیرۃ النبی کی کس قدر زیادتی ہے کہ فضائل کے لئے بھی صحتِ حدیث کی شرط لگائی۔ اور اسی پر بس نہیں ان کے یہاں حدیث صحیح لغیرہ اور حسن لذاتہ یا حسن لغیرہ کا تو کہیں ذکر ہی نہیں ملتا۔ گزر چکا کہ اس درجہ کی حدیثیں احکام کے لئے بھی کافی ہیں۔

اب یہاں اس اصول کی طرف توجہ دلانی مقصود ہے کہ کوئی حدیث اگر کئی ضعیف سندوں سے مروی ہو تو وہ قوی ہو جاتی ہے جیسے چند کمزور دھاگے مل کر مضبوط ہو جاتے ہیں۔ یہ عقل و نقل کا مسلّم اصول ہے مگر مؤلف سیرۃ النبی نے یہاں بھی شدت برتی ہے۔ یہاں تک کہ سات سندوں سے روایتِ حدیث کے باوجود اس کو بے اعتبار ہی رکھا ہے [2] جب کہ محدثین کی صراحت ہے کہ دو سندیں بھی ہو جائیں تو حدیثِ ضعیف قوی ہو جاتی ہے۔ اور اتنی قوت آ جاتی ہے کہ حسن لغیرہ ہو کر نہ صرف فضائل بلکہ احکام میں بھی مقبول ہو جاتی ہے۔ اب آپ غور فرمائیں کہ اس تشدد کا کوئی ٹھکانا ہے کہ جو حدیث احکام میں مقبول ہو اور اس سے حلال و حرام کے مسائل ثابت کئے جا سکتے ہوں وہ ان کے یہاں فضائل میں بھی معتبر نہیں۔ اب ہم اسے رسول دوستی کا جذبہ کہیں یا رسول دشمنی کا نام دیں؟

آیئے ہم معتمد علمائے اسلام کی تصریحات دکھائیں کہ حدیث ضعیف اگر ایک سے زیادہ سندوں سے مروی ہو جائے تو قوت پا جاتی ہے۔ یہاں تک کہ کبھی حسن لغیرہ

---

[1] فتاویٰ رضویہ ج ۲ ص ۴۱۸ تا ۴۲۰ ملخصاً مطبوعہ دہلی۔

[2] سیرۃ النبی سوم ص ۷۵۳ روایت ابن سعد۔ روشنی وقت ولادت اقدس، طبقات ابن سعد مطبوعہ لیڈن ج ۱ ص ۶۳ و ۹۶

ہو کر احکام اور مسائلِ حلال و حرام میں معتبر ہو جاتی ہے۔ بشرطیکہ ضعفِ شدید نہ ہو۔

(۱) مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح میں ہے :۔

تعدد الطرق یبلغ الحدیث الضعیف الی حد الحسن (مرقات آخر الفصل الثانی باب الایجوز من العمل فی الصلوٰۃ)

متعدد روایتوں سے آنا حدیث ضعیف کو درجۂ حسن تک پہنچا دیتا ہے۔

(۲) آخر موضوعات کبیر میں فرمایا :۔

تعدد الطرق ولو ضعفت یرقی الحدیث الی الحسن۔

متعدد سندیں اگرچہ سب ضعیف ہوں حدیث کو درجۂ حسن تک پہنچا دیتی ہیں۔

(۳) محقق علی الاطلاق ہدایہ کی شرح فتح القدیر میں فرماتے ہیں :۔

لو تم تضعیف کلها کانت حسنة لتعدد الطرق وکثرتها۔ (فتح : مسألة السجود علی کور العمامة)

اگر سب کا ضعف ثابت ہو جائے تاہم حدیث حسن ہو گی کیونکہ سندیں متعدد و کثیر ہیں۔

(۴) اسی میں ہے :۔

جاز فی الحسن ان یرتفع الی الصحة اذا کثرت طرقه والضعیف یصیر حجة بذالك لان تعدده قرینة علی ثبوته فی نفس الامر (فی مسئلة التنفل قبل المغرب)

جائز ہے کہ حدیث حسن کثرت طرق سے درجۂ صحت تک ترقی پائے، اور حدیث ضعیف اس کے سبب حجت ہو جاتی ہے کہ تعدد اسانید ثبوتِ واقعی پر قرینہ ہے۔

(۵) امام عبدالوہاب شعرانی میزان الشریعۃ الکبریٰ میں فرماتے ہیں :۔

قد احتج جمهور المحدثین بالحدیث الضعیف اذا کثرت طرقه والحقوه بالصحیح تارة وبالحسن اخری۔ وهذا النوع من

بے شک جمہور محدثین نے حدیث ضعیف کو کثرت طرق سے حجت مانا اور اسے کبھی صحیح اور کبھی حسن سے ملحق کیا۔ اس قسم کی ضعیف حدیثیں امام بیہقی کی "سنن کبریٰ"

الضعیف یوجد کثیرا فی کتاب السنن الکبری للبیهقی التی الفها بقصد الاحتجاج لاقوال الائمه واقوال اصحابهم (الفصل الثالث من فصول فی الاجوبة عن الامام ابی حنیفة رضی الله تعالیٰ عنه)

میں بکثرت پائی جاتی ہیں جسے انہوں نے ائمہ مجتہدین اور اصحاب ائمہ کے مذاہب پر دلائل بیان کرنے کی غرض سے تالیف فرمایا۔

(۶) امام ابن حجر مکی صواعق محرقہ میں روز عاشورا عیال پر وسعت و فراخی کرنے سے متعلق حدیث کے تحت امام ابوبکر بیہقی سے ناقل ہیں۔

هذه الاسانید وان کانت ضعیفة لکنها اذا ضم بعضها الی بعض احدثت قوة۔

یہ سندیں اگرچہ سب ضعیف ہیں مگر آپس میں مل کر قوت پیدا کریں گی۔

(۷) امام جلال الدین سیوطی تعقبات علی الموضوعات میں فرماتے ہیں۔

المتروك او المنکر اذا تعددت طرقه ارتقت الی درجة الضعیف الغریب بل ربما ارتقی الی الحسن۔ (باب المناقب حدیث النظر الی علی عبادة)

یعنی متروک یا منکر کہ سخت قوی الضعف ہیں یہ بھی تعدد طرق سے ضعیف غریب بلکہ کبھی حدیث حسن کے درجہ تک ترقی کرتی ہیں۔

دو سندوں سے بھی حدیث ضعیف قوی ہو جاتی ہے

اب یہ ارشادات علما دیکھئے کہ تقویت ضعیف کے لئے کثیر سندیں ہی ضروری نہیں بلکہ دو طریق سے بھی قوت حاصل ہو جاتی ہے۔

(۱) علامہ عبدالرؤف مناوی تیسیر شرح جامع صغیر میں فرماتے ہیں :

ضعیف بضعف عمرو بن واقد لکنه یقوی بورودہ

یعنی حدیث تو اپنے راوی عمرو بن واقد متروک کے باعث ضعیف ہے مگر

من طریقین. دو سندوں سے آکر قوت پا گئی۔

(ص ۴۰۴ فتاوی رضویہ دوم)

(۲) اسی میں حدیث "اکرموا العزی وامسحوا برغامها فانها من دواب الجنة" جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے اسے یزید نوفلی کے سبب ضعیف کہا۔ پھر اس حدیث کے شاہد بروایت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق فرمایا۔

اسناده ضعیف لکن یجبره ما قبله فیتعاضدان. سند اس کی بھی ضعیف ہے لیکن پہلی سند اسکی تلافی کرتی ہے تو دونوں کی قوی ہو جائیں گی۔

(۳) حدیث اکرموا العلماء فانهم ورثة الانبیاء جامع صغیر میں دو طریقوں سے نقل ہوئی اول ابن عساکر عن ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔ دوم خطیب فی التاریخ عن جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔

علامہ مناوی نے تیسیر میں اور علامہ عزیزی نے سراج منیر میں طریق اول کے تحت لکھا۔

ضعیف لکن یقویه ما بعده. ضعیف ہے مگر پچھلی حدیث اسے قوت دیتی ہے۔

دوسرے طریق کے تحت فرمایا۔

ضعیف لضعف الضحاك بن حجرة لکن یعضده ما قبله. ضحاک بن حجرہ کے ضعف سے یہ بھی ضعیف ہے مگر پہلی اسے طاقت بخشتی ہے۔

تلاش کرنے والا ارشادات علما سے اس کی بہت سی مثالیں نکال سکتا ہے خود مؤلف سیرۃ النبی نے اپنے تمام خود ساختہ اصول وضوابط توڑتے ہوئے ایک جگہ فرمایا ہے کہ تعدد طرق سے ضرور تائید حاصل ہوتی ہے۔

تیسری بحث

قبول علما اور عمل علما سے حدیث ضعیف قوی ہو جاتی ہے۔ یہ مشہور اصول ہے۔

مگر مؤلف سیرۃ النبی نے ایسی حدیثوں کا بھی انکار کر ڈالا ہے جو ہمیشہ سے علما و محدثین میں مقبول رہی ہیں۔ مثلاً وہ حدیث جس میں حضرت آمنہ فرماتی ہیں کہ وقت ولادت ایسی روشنی نکلی جس سے شام کے محلات جگمگا اٹھے۔ اب دیکھئے علما کیا فرماتے ہیں:۔

(۱) امام سیوطی تعقبات میں امام بیہقی سے نقل فرماتے ہیں۔

تداولها الصالحون بعضهم عن بعض وفی ذالك تقویة للحدیث المرفوع. اسے صالحین نے ایک دوسرے سے اخذ کیا اور ان کے اخذ میں حدیث مرفوع کی تقویت ہے۔

(باب الصلاۃ حدیث صلاۃ التسبیح)

(۲) اسی میں ہے۔

قد صرح غیر واحد بان من دلیل صحة الحدیث قول اهل العلم به وان لم یکن له اسناد یعتمد علی مثله. متعدد علما نے فرمایا ہے کہ اہل علم کی موافقت صحت حدیث کی دلیل ہوتی ہے۔ اگرچہ اس کے لئے کوئی سند قابل اعتماد نہ ہو۔

(باب الصلوٰۃ حدیث من جمع بین الصلاتین من غیر عذر)

(۳) ملا علی قاری مرقات میں فرماتے ہیں:۔ (باب ما علی المأموم فی المتابعة اول الفصل الثانی)

"امام ترمذی نے فرمایا حدیث غریب ہے اور اہل علم کا اس پر عمل ہے۔ سید میرک نے امام نووی سے نقل کیا کہ اس کی سند ضعیف ہے۔ تو گویا امام ترمذی عمل اہل علم سے حدیث کو قوت دینا چاہتے ہیں واللہ تعالیٰ اعلم۔ اس کی نظیر وہ ہے کہ سیدی شیخ اکبر امام محی الدین ابن عربی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: مجھے حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے حدیث پہنچی تھی کہ جو شخص ستر ہزار بار لا الہ الا اللہ کہے اس کی مغفرت ہو اور جس کے لئے پڑھا جائے

اس کی مغفرت ہو"۔ میں نے لا الٰہ الا اللہ اتنی بار پڑھا تھا۔ اس میں کسی کے لئے خاص نیت نہ کی تھی۔ اپنے بعض رفیقوں کے ساتھ ایک دعوت میں گیا۔ ان میں ایک جوان کے کشف کا شہرہ تھا۔ وہ کھانا کھاتے کھاتے رونے لگا۔ میں نے سبب پوچھا کہا" اپنی ماں کو عذاب میں دیکھتا ہوں"۔ میں نے اپنے دل میں کلمہ کا ثواب اس کی ماں کو بخش دیا۔ فورًا وہ جوان ہنسنے لگا اور کہا اب میں اسے اچھی جگہ دیکھتا ہوں۔ امام محی الدین قدس سرہ فرماتے ہیں:۔ تو میں نے حدیث کی صحت اس جوان کے کشف کی صحت سے پہچانی اور اس کے کشف کی صحت حدیث کی صحت سے جانی"۔

چوتھی بحث

مؤلف سیرۃ النبی نے حدیث ضعیف کو بالکل موضوع کے ہم پلہ رکھا ہے۔ جس نفرت وحقارت کے ساتھ موضوع کا ذکر ہونا چاہئے اسی طرح ضعیف کو بھی ذکر کیا ہے یوں ہی موضوع جس طرح بالکل بے اعتبار ہے اور فضائل ومناقب میں بھی کارآمد نہیں وہی حال ضعیف کا کر رکھا ہے۔

دوسرا صریح دھوکہ یہ دیا ہے کہ صحیح کا مقابل جا بجا غلط لکھا ہے جیسا کہ اردو محاورہ میں رائج ہے۔ حالانکہ حدیث صحیح بہت اعلیٰ درجہ کی حدیث کو کہتے ہیں جس کے شرائط بہت ہیں اور ان شرائط کے فقدان سے حدیث باطل وغلط نہیں ہو جاتی بلکہ کبھی صحیح لغیرہ، حسن لذاتہ اور حسن لغیرہ ہوتی ہے جو احکام میں بھی مقبول ہے اور کبھی ضعیف بھی ہو سکتی ہے جو فضائل میں بالاتفاق معتبر ہے۔

مؤلف کے مذکورہ فہم کا ثبوت یہ ہے کہ امام جلیل علامہ جلال الدین سیوطی کی خصائص کبریٰ کے بارے میں یہ تسلیم کیا ہے کہ وہ موضوعات سے خالی ہے۔ پھر بھی فرماتے ہیں اس میں صحیح وغلط سب ہے۔ جب کہ اردو محاورہ میں غلط سے مراد جھوٹ، باطل اور لغو ہوتا ہے۔ کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ غلط کا معنی حسن اور عمدہ بھی ہے اسی طرح جا بجا "صحیح نہیں" اور "غیر صحیح" کے لفظ سے اسی خود فریبی یا فریب دہی کا مظاہرہ فرمایا ہے۔ عام اردو داں قاری "صحیح نہیں اور غیر صحیح" کا متبادر معنیٰ یہ لے گا کہ غلط ہے۔ موضوع ہے۔ جب کہ اصطلاح اصول میں غیر صحیح کا یہ معنی ہرگز نہیں ہو سکتا۔ دیکھئے علما کیا فرماتے ہیں:۔

(۱) امام بدرالدین زرکشی کتاب النکت علی ابن الصلاح۔ پھر امام جلال الدین سیوطی لآلی مصنوعہ پھر علامہ علی بن محمد بن عراق کنانی تنزیہ الشریعۃ المرفوعۃ عن الاخبار الشنیعۃ الموضوعۃ۔ پھر علامہ محمد طاہر فتنی خاتمۂ مجمع بحار الانوار میں فرماتے ہیں۔

بین قولنا "لا یصح" و قولنا "موضوع" بون کبیر فان الوضع اثبات الکذب والاختلاق۔ وقولنا لا یصح لا یلزم منہ اثبات العدم وانما ھو اخبار عن عدم الثبوت وفرق بین الامرین۔[1]

ہم محدثین کا کسی حدیث کو کہنا کہ یہ صحیح نہیں اور موضوع کہنا ان دونوں میں بڑا فرق ہے کہ موضوع کہنا تو اسے کذب افترا ٹھہرانا ہے اور غیر صحیح کہنے سے نفی حدیث لازم نہیں بلکہ اس کا حاصل تو سلب ثبوت ہے اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔

یہ لفظ لآلی کے ہیں اور اسی سے مجمع میں مختصرًا نقل کیا تنزیہ میں اس کے بعد اتنا اور زیادہ فرمایا۔

وھذا یجئ فی کل حدیث قال فیہ ابن الجوزی لا یصح ونحوہ۔

یعنی امام ابن جوزی نے کتاب موضوعات میں جس جس حدیث کو غیر صحیح یا اس کے مانند کوئی لفظ کہا ہے ان سب میں یہی تقریر جاری ہوگی کہ ان اوصاف کے عدم سے ثبوت وضع سمجھنا غلط اور نادرست ہے۔

---

[1] فتاویٰ رضویہ دوم۔ امام احمد رضا قدس سرہٗ ص ۳۸۹ مطبوعہ دہلی۔

(۲) امام ابن حجر عسقلانی القول المسدد فی الذب عن مسند احمد میں فرماتے ہیں :۔

لایلزم من کون الحدیث لم یصح ان یکون موضوعا۔

حدیث کے صحیح نہ ہونے سے موضوع ہونا لازم نہیں آتا۔

(۳) امام سیوطی کتاب التعقبات علی الموضوعات میں فرماتے ہیں :۔

اکثر ما حکم الذھبی علی ھذا الحدیث انہ قال "متن لیس بصحیح" ـــ وھذا صادق بضعفہ۔

زیادہ سے زیادہ اس حدیث پر امام ذہبی نے اتنا حکم کیا کہ یہ متن صحیح نہیں ـــ یہ بات ضعیف ہونے سے بھی صادق ہے۔

(۴) علامہ علی قاری موضوعات میں احادیث عقل کے تحت فرماتے ہیں :۔

لایلزم من عدم الصحۃ وجود الوضع کما لایخفی۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ حدیث کے صحیح نہ ہونے سے موضوع ہونا لازم نہیں آتا۔

(۵) اسی میں روز عاشورا سرمہ لگانے کی حدیث پر امام احمد بن حنبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حکم "لایصح ھذا الحدیث" نقل کرکے فرماتے ہیں :۔

قلت لایلزم من عدم صحتہ ثبوت وضعہ غایتہ انہ ضعیف۔

میں کہتا ہوں اس کے صحیح نہ ہونے سے موضوع ہونا لازم نہیں، زیادہ سے زیادہ یہ کہ ضعیف ہو۔

(۶) علامہ طاہر صاحب مجمع بحار الانوار، تذکرۃ الموضوعات میں امام سند الحفاظ علامہ ابن حجر عسقلانی سے نقل فرماتے ہیں :۔

ان لفظ "لایثبت" لایثبت الوضع۔ فان الثابت یشمل الصحیح فقط، والضعیف دونہ۔

کسی حدیث کو بے ثبوت کہنے سے اس کی موضوعیت ثابت نہیں ہوتی کہ ثابت تو وہی حدیث ہے جو صحیح ہو اور ضعیف کا درجہ اس سے کم ہے۔

(۷) بلکہ علامہ علی قاری موضوعات کبیر کے آخر میں حدیث البطیخ قبل

الطعام یغسل البطن غسلا ویذھب بالداء اصلا (قبل طعام خربوزہ کھانا شکم کو صاف کردیتا ہے اور بیماری ختم کردیتا ہے) کے بارے میں امام ابن عساکر کا قول "شاذ لایصح" نقل کرکے فرماتے ہیں :۔

ھو یفید انہ غیر موضوع کما لایخفی۔

ان کا یہ کہنا ہی بتا رہا ہے کہ حدیث موضوع نہیں جیسا کہ ظاہر ہے۔

یعنی موضوع جانتے تو باطل یا کذب یا موضوع یا مفتری یا مختلق کہتے، نفی صحت پر کیوں اقتصار کرتے، فافہم واللہ تعالیٰ اعلم۔

علامہ علی قاری جیسے امام مجدد، بلکہ ان سے بھی جلیل القدر حفاظ حدیث اور ائمہ اکابر کا طریقہ تو یہ ہے کہ "لایصح" دیکھ کر یہی نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ موضوع نہیں، مؤلف سیرۃ النبی کا حال یہ ہے کہ ایک حدیث فضائل نقل کرکے فرماتے ہیں :۔

> "اس روایت کا ماخذ یہ ہے کہ یحیٰی بن عائذ المتوفی ۲۵۸ھ نے اپنی کتاب میلاد میں اس کا ذکر کیا ہے ـــ ابن دحیہ محدث نے بڑی جرأت کرکے اس خبر کو "غریب" کہا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کو غریب کہنا بھی اس کی توثیق ہے، یہ تمام تر بے اصل اور بے بنیاد ہے ـــ ص ۱۵۷، جلد سوم۔

دیکھا آپ نے فضائل دشمنی ؟ ابن دحیہ محدث نے غریب کہا، غریب اس سند کو کہتے ہیں جس کا راوی ایک ہو ظاہر ہے کہ انہیں اس کی سند پر اطلاع تھی اگرچہ ابن عائذ نے ذکر نہ کی ہو، جب تو غریب فرمایا۔ لیکن مؤلف کو یہ توثیق پسند نہ آئی۔ انہیں تو ابن تیمیہ و ابن قیم جیسا محدث چاہئے۔ جو صحیح احادیث کو بلا دلیل رد کرتا جائے اور پوری جرأت کے ساتھ موضوع ٹھہرائے چنانچہ اسی طریقہ پر عمل کرتے ہوئے باوجود بے خبری کے کمال جسارت کے ساتھ فرمادیا۔ "یہ تمام تر بے اصل اور بے بنیاد ہے" معلوم نہیں ان پر کہاں سے اس کی بے اصلی کی وحی نازل ہوگئی۔

بس اسی سے اندازہ لگا لیجئے کہ فضائل دشمنی نے ان کی تنقیدات کو کہاں سے

کہاں تک پہنچا دیا ہے۔

اب یہ ارشادات دیکھئے کہ "غیر صحیح" اور صحیح نہیں کہنے سے حسن کی بھی نفی نہیں ہوتی، اثباتِ موضوعیت تو بہت دور کی بات ہے۔

(۱) امام ابن حجر مکی صواعق محرقہ میں فرماتے ہیں:۔

قول احمد انہ حدیث لایصح ای لذاتہ فلا ینفی کونہ حسنا لغیرہ والحسن لغیرہ یحتج بہ کما بین فی الحدیث۔[1]

یعنی امام احمد کا فرمانا کہ یہ حدیث صحیح نہیں اس کے یہ معنی نہیں کہ صحیح لذاتہ نہیں تو یہ حسن لغیرہ ہونے کی نفی نہیں کرے گا اور حسن اگرچہ لغیرہ ہو حجت ہے جیسا کہ علم حدیث میں بیان ہو چکا۔

(۲) سند الحفاظ امام ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اذکار امام نووی کی تخریج احادیث میں فرماتے ہیں۔

من نفی الصحۃ لاینتفی الحسن اھ ملخصا۔

صحت کی نفی سے حدیث کے حسن ہونے کی نفی نہیں ہوتی۔

(۳) یہی امام۔ نزھۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر میں فرماتے ہیں:۔

ھذا القسم من الحسن مشارک للصحیح فی الاحتجاج بہ وان کان دونہ۔

حدیث حسن لذاتہ اگرچہ صحیح سے کم درجہ میں ہو مگر حجت ہونے میں صحیح کی شریک ہے۔

(۴) مولانا علی قاری موضوعات کبیر میں فرماتے ہیں:۔

لایصح لا ینافی الحسن اھ ملخصا۔

محدثین کا قول کہ یہ حدیث صحیح نہیں اس کے حسن ہونے کی نفی نہیں کرتا۔

---

[1] ذکرہ فی حدیث التوسعۃ علی العیال یوم العاشوراء فی آخر الفصل الاول من الباب الحادی عشر قبیل الفصل الثانی ۱۲ فتاوی رضویہ ص۳۸۰ ج ۲۔

(۵) نورالدین علی سمہودی جواہر العقدین فی فضل الشرفین میں فرماتے ہیں:۔

قد یکون غیر صحیح وھو صالح للاحتجاج بہ اذا الحسن رتبۃ بین الصحیح والضعیف۔[1]

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ حدیث صحیح نہیں پھر بھی وہ حجت ہونے کے قابل ہوتی ہے کیونکہ صحیح وضعیف کے درمیان ایک درجہ حسن کا بھی ہے۔

(۶) شیخ محقق مولانا عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ شرح صراط المستقیم میں فرماتے ہیں:۔

"حکم بعدم صحت کردن حسب اصطلاح محدثین غرابت ندارد۔ چہ صحت در حدیث چنانچہ در مقدمہ معلوم شد درجہ اعلیٰ است دائرہ آں تنگ تر ست جمیع احادیث کہ در کتب مذکور است حتی در یں شش کتب کہ آں را صحاح ستہ گویند ہم بہ اصطلاح ایشاں صحیح نیست۔ بلکہ تسمیۂ آں صحاح باعتبار تغلیب است۔

عدم صحت کا حکم اصطلاح محدثین کے اعتبار سے کوئی اچنبھے کی بات نہیں کیونکہ جیسا کہ مقدمہ میں معلوم ہو چکا ہے کہ حدیث میں "صحت" ایک اعلیٰ درجہ ہے جس کا دائرہ بہت تنگ ہے۔ تمام حدیثیں جو کتابوں میں مذکور ہیں یہاں تک کہ ان چھ کتابوں میں بھی جن کو صحاح ستہ کہتے ہیں وہ بھی محدثین کی اصطلاح پر (سب کی سب) صحیح نہیں بلکہ ان کو صحاح بس تغلیبًا اور بلحاظ اکثر کہتے ہیں۔

(۷) مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں امام محقق علی الاطلاق کمال الدین محمد بن الہمام رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے منقول ہے۔

وقول من یقول فی حدیث انہ لم یصح ان سلم لم یقدح لان الحجیۃ لا

کہنے والے کا کسی حدیث کی نسبت یہ کہنا کہ وہ صحیح نہیں اگر مان لیا جائے تو کچھ حرج نہیں ڈالتا کہ حجت ہونا

---

[1] فتاوی رضویہ دوم ص ۳۸۷

تتوقف علی الصحة بل الحسن کافٍ۔

صحیح ہونے پر موقوف نہیں، بلکہ حسن کافی ہے۔

مراتب حدیث اور غیر صحیح کا معنیٰ

یہاں امام احمد رضا قادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ارشاد قابل حفظ ہے جو توضیح و تلخیص کے ساتھ نقل کیا جاتا ہے۔ منیر العین فی تقبیل الابھامین میں صحت و حسن اور ضعف وغیرہ پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

"یہ بات خوب یاد رکھنے کی ہے کہ کسی محدث نے اگر حدیث کے صحیح ہونے سے انکار فرمایا تو اس سے باطل و موضوع ہونا تو درکنار حسن ہونے کی بھی نفی نہیں ہوتی اور حدیث حسن تو احکام میں بھی مقبول ہے اس لئے صحیح نہ ہونے کا یہ معنی بھی نہیں کہ قابل اعتبار اور صالح و معتمد نہیں۔

صحیح و موضوع دونوں ابتدا و انتہا کے کناروں پر واقع ہیں ـــــ سب سے اعلیٰ صحیح ـــــ اور سب سے بدتر موضوع ـــــ اور درمیان میں بہت اقسام حدیث ہیں ـــــ درجہ بدرجہ باترتیب، صحیح[1] ـــــ کے بعد حسن لذاتہ بلکہ صحیح لغیرہ ـــــ پھر حسن[2] لذاتہ ـــــ پھر حسن[3] لغیرہ ـــــ

(۵) پھر ضعیف بضعف قریب ـــــ اس حد تک کہ معتبر ہونے کی صلاحیت باقی رہے، جیسے اختلاطِ راوی، یا سوء حفظ یا تدلیس وغیرہا ـــــ

اول کی تین بلکہ چاروں قسم کو ایک مذہب پر نام ثبوت شامل ہے اور وہ سب قابلِ استدلال ہیں۔ اور آخر کی قسم (پانچویں) صالح یہ متابعات و شواہد میں کام آتی ہے اور جابر (ضعف کی تلافی کرنے والی چیز) سے قوت پاکر حسن لغیرہ بلکہ صحیح لغیرہ ہو جاتی ہے ـــــ اس وقت وہ اس گراں قدر رتبہ تک پہنچ جاتی ہے کہ احکام میں قابل استدلال ہو۔ اور فضائل میں تو بغیر کسی تلافی کرنے والی چیز کے تنہا مقبول اور کافی ہے۔

(۶) پھر درجہ ششم میں ضعف قوی و وہنِ شدید ہے ـــــ جیسے راوی کے

فسق وغیرہ قوی جرحوں کے سبب متروک ہونا بشرطیکہ ابھی سرحدِ کذب سے جدا ہو۔

یہ حدیث احکام میں استدلال تو کیا اعتبار کے بھی لائق نہیں۔ ہاں فضائل میں مذہب راجح پر مطلقاً معتبر و منقول ہے۔

(۷) پھر درجہ ہفتم میں مرتبہ مطروح ہے۔ جس کا مدار وضاع، کذاب، یا متہم بالکذب پر ہو ـــــ یہ بدترین اقسام ہے ـــــ بلکہ بعض محاورات کی رُو سے مطلقاً عین موضوع ہے ـــــ اور ایک اصطلاح میں مطلقاً موضوع نہیں بلکہ اس کی شدید ترین نوع جس کا مدار کذب پر ہو ـــــ یا نظرِ تدقیق میں یوں کہئے کہ ان اطلاقات پر داخل موضوع حکمی ہے۔

(۸) ان سب کے بعد درجہ موضوع کا ہے، یہ بالاجماع فضائل وغیرہ کسی باب میں اعتبار کے لائق نہیں ـــــ بلکہ اسے حدیث کہنا ہی توسعاً اور مجازاً ہے حقیقۃً حدیث نہیں ـــــ محض کسی کی من گھڑت اور افترا ہے۔ والعیاذ باللہ تعالیٰ۔

ـــــ طالب تحقیق ان چند حرفوں کو یاد رکھے کہ وجازت و اختصار کے باوجود اپنے دامن میں بڑی تفصیل اور علم کثیر رکھتے ہیں ـــــ اور شاید اس تحریر نفیس کے ساتھ ان سطور کے غیر میں کم ملیں ـــــ وللہ الحمد والمنۃ۔

خیر بات دور پڑتی ہے ـــــ کہنا اس قدر ہے کہ جب صحیح و موضوع کے درمیان اتنی منزلیں ہیں تو "انکار صحت" سے "اثبات وضع" (غیر صحیح کہنے سے موضوع کہنا) ماننا، زمین و آسمان کے قلابے ملانا ہے۔ بلکہ نفی صحت اگر بمعنی نفی ثبوت ہی لیجئے (یعنی اس فرقۂ محدثین کی اصطلاح پر جس کے نزدیک لفظ ثبوت، صحت و حسن دونوں کو شامل) تاہم اس کا حاصل اس قدر ہوگا کہ صحیح و حسن نہیں ـــــ نہ یہ کہ باطل و موضوع ہے ـــــ حسن و موضوع کے بیچ بھی دور دراز میدان پڑے ہیں[1]

---

[1] امام احمد رضا قادری: العطایا النبویہ فی الفتاوی الرضویہ ج ۲ ص ۳۸۷، ۳۸۸۔ مطبوعہ دہلی

پانچویں بحث

راوی کے مجہول ہونے سے حدیث باطل و موضوع نہیں ہوتی

مؤلف نے بہت سی سندوں پر راوی کے مجہول ہونے کے سبب طعن کیا ہے اور انہیں بے اعتبار ٹھہرایا ہے ــــ حالانکہ خود انہیں تسلیم ہے کہ :-

"ہمارے علمائے رجال نے زیادہ تر ان راویوں کی بحث و تدقیق کی ہے جو پہلی تین صدیوں میں تھے۔ اس لئے چوتھی اور پانچویں صدی کے رُواۃ اور رجال کے نام ونشان ہماری موجودہ اسماء الرجال کی کتابوں میں بہت کم ملتے ہیں۔ اگر تراجم وانساب میں ان کے کچھ حالات مل جاتے ہیں تو محدثانہ حیثیت سے ان پر نقد وتبصرہ نہیں ملتا اس لئے ان بزرگوں کے شیوخ اور راویوں میں "مجہول الحال" اشخاص کی کمی نہیں۔ اس بنا پر ان کتابوں کی روایتوں کی تنقید کرنا نہایت مشکل ہے" (سیرۃ النبی سوم ص ۲۵، طبع چہارم)

مگر کمال تو جب ہے کہ بے خبری کے باوجود اس مشکل کو سر کر کے دکھا دیا جائے ــ اور جا بجا یہ تحریر فرما کر کہ "فلاں راوی کا کچھ پتہ نہیں" فلاں روایت میں متعدد مجاہیل ہیں" احادیث وروایات کو باطل قرار دیا جائے ــ سوال یہ ہے کہ جب اسماء الرجال کے مصنفین نے ان رواۃ کے متعلق کوئی سرمایہ اپنی کتابوں میں رکھا ہی نہیں تو یہ فیصلہ کیوں کر ہو گیا کہ ہم جس طرح ان سے جاہل و بے خبر ہیں وہ حضرات مصنفین اور ان رواۃ سے روایت کرنے والے محدثین بھی ان سے بے خبر رہے ہیں ــ اور واقعۃً وہ رواۃ مجہول ہی رہے ہوں ــ اس سے تو یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ جب کتب اسماء الرجال خود ہی ناقص ہیں تو جہالت راوی سے سندوں اور روایات پر کچھ اثر نہیں پڑ سکتا ــ ثقات محدثین نے ان سے روایت کی

تو بہت ممکن یا عین واقع ہے کہ وہ رواۃ معتبر اور قوی ہوں ــ

خیر اصولی حیثیت سے اتنا تو بالکل متعین ہے کہ راوی کے مجہول ہونے سے سند باطل اور موضوع ہرگز نہیں ہوتی ــــ بلکہ خود محدثین کا اسی میں اختلاف ہے کہ راوی کے مجہول ہونے سے حدیث ضعیف بھی ہوتی ہے یا نہیں ؟

اس بحث کی تفصیل یہ ہے کہ مجہول کی تین قسمیں ہیں۔

اوّل :- مستور : جس کی عدالت ظاہری معلوم۔ اور عدالت باطنی کی تحقیق نہیں۔ اس قسم کے راوی صحیح مسلم شریف میں بہت ہیں۔

دوم : مجہول العین :- جس سے صرف ایک ہی شخص نے روایت کی ہو ــــ (بعض علما تو ایسے کو مجہول مانتے ہی نہیں جب کہ اس کا راوی معتمد ہو یا صرف عادل سے روایت کرتا ہو) ۔

سوم : مجہول الحال :- جس کی عدالت ظاہری و باطنی کچھ ثابت نہیں۔ (کبھی قسم اول مستور کو بھی مجہول الحال کہہ دیتے ہیں۔ جو معتبر ہے)

تینوں کے احکام

قسم اول یعنی مستور جمہور محققین کے نزدیک معتبر ہے۔ یہی امام الائمہ سیدنا امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مذہب ہے[1] ــــ امام نووی فرماتے ہیں یہی صحیح ہے[2] اسی کی طرف امام ابو عمرو بن الصلاح کا میلان ہے[3] ــــ

باقی دو قسموں کو بعض اکابر حجت مانتے ہیں۔ جمہور باعث ضعف مانتے ہیں[4] بلکہ امام نووی نے تو فرمایا ہے کہ بہت سے محققین مجہول العین کو بھی مقبول مانتے ہیں[5] ــــ بلکہ امام اجل عارف باللہ سیدی ابو طالب کی قدس سرہ اسی کو فقہائے کرام اور اولیائے کرام علیہم الرحمۃ والرضوان کا مذہب قرار دیتے ہیں۔

---

[1] فتح المغیث [2] تدریب الراوی [3] مقدمہ ابو عمرو بن الصلاح [4] الفیہ امام زین الدین عراقی، تقریب النواوی وتدریب الراوی [5] مقدمہ منہاج شرح مسلم۔

اپنی عظیم الشان کتاب قوت القلوب فی معاملۃ المحبوب کی فصل ۳۱ میں فرماتے ہیں۔

"بعض ما یضعف بہ رواۃ الحدیث، وتعلل احادیثھم لایکون تعلیلا ولا جرحا عند الفقہاء ولا عند العلماء باللہ تعالیٰ مثل ان یکون الراوی مجھولا لا یشارۃ الخمول وقد ذھب الیہ اولقلۃ الاتباع لہ اذ لم یقع لھم الاشرۃ عنہ[1]

بعض وہ باتیں جن کے سبب راویوں کو ضعیف اور ان کی حدیثوں کو غیر صحیح کہہ دیا جاتا ہے فقہا و اولیا کے نزدیک باعث ضعف و جرح نہیں ہوتیں۔ جیسے راوی کا مجہول ہونا اس لئے کہ اس نے گوشۂ گمنامی میں رہنا ہی پسند کیا، کیونکہ خود شریعت مطہرہ نے اس کی ترغیب دی ہے یا اس کے شاگرد کم ہوئے اس لئے لوگوں کو اس سے روایت کا اتفاق نہ ہوا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ خود اس میں اختلاف ہے کہ راوی مجہول ہونے سے حدیث ضعیف و قابل جرح بھی ہوتی ہیں یا نہیں؟ — یہ کوئی نہیں کہتا کہ جس حدیث کا راوی مجہول ہو خواہی نخواہی وہ باطل و مجعول ہو۔ اگر کسی متشدد نے دعوی بھی کیا تو علما نے اسے رد کر دیا۔

دیکھئے مولانا علی قاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ رسالہ فضائل نصف شعبان میں فرماتے ہیں:۔

جھالۃ بعض الرواۃ لاتقتضی کون الحدیث موضوعا وکذا نکارۃ الالفاظ، فینبغی ان یحکم علیہ بانہ ضعیف۔ ثم یعمل بالضعیف فی فضائل الاعمال (۳۹۱ فتاوی رضویہ دوم)

بعض راویوں کے مجہول یا الفاظ کے بے قاعدہ ہونے کا یہ تقاضا نہیں ہے کہ حدیث موضوع ہو۔ ہاں ضعیف کہو۔ پھر فضائل اعمال میں ضعیف پر عمل ہوتا ہے۔

[1] فتاوی رضویہ دوم ص ۳۹۱۔ قوت القلوب فی معاملۃ المحبوب۔ ابوطالب محمد بن علی کی م ۳۸۶ھ — ج ۱ ص ۱۷۷۔

موضوعات کبیر میں استاذ المحدثین امام زین الدین عراقی سے نقل فرماتے ہیں:۔

انہ لیس بموضوع وفی سندہ مجھول۔

یہ موضوع نہیں۔ اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے۔

اہل علم وفن کے نزدیک یہ بالکل واضح اور طے شدہ مسئلہ ہے اور ان کی کتابوں میں اس پر بکثرت تنبیہات موجود ہیں۔ نظر چاہئے۔

چھٹی بحث

مجہول تو کیا مبہم سے بھی حدیث باطل نہیں ہوتی

جہالت راوی کا حاصل تو یہی تھا کہ شاگرد ایک، یا عدالت مشکوک، شخص تو متعین تھا کہ فلاں ہے۔ مبہم میں تو اتنا بھی نہیں ہے۔ جیسے "حدثنی رجل" مجھ سے ایک شخص نے حدیث بیان کی۔ یا اخبرنی بعض اصحابنا۔ مجھے ایک رفیق نے خبر دی — مگر اصولی حیثیت سے راوی مبہم کی حدیث بھی صرف ضعیف ہے موضوع ہرگز نہیں۔

(۱) علامہ ابن حجر عسقلانی رسالہ "قوت الحجاج فی عموم المغفرۃ للحجاج" میں پھر خاتم الحفاظ امام جلال الدین سیوطی لآلی مصنوعہ میں فرماتے ہیں:۔

لایستحق الحدیث ان یوصف بالوضع بمجرد ان راویہ لم یسم۔

حدیث کو صرف اس وجہ سے موضوع نہیں کہا جاسکتا کہ اس کے راوی کا نام ذکر نہیں۔

(۲) تعقبات علی الموضوعات میں ہے:۔

رجالہ ثقات الا ان فیہ مبھما لم یسم فان کان ثقۃ فھو علی شرط

اس حدیث کے راوی ثقہ ہیں، مگر اس میں ایک راوی مبہم ہے جس کا نام نہیں اگر وہ ثقہ ہے جب تو یہ حدیث بر شرط صحیح ہے

الصحیح وان کان ضعیفا فھو عاضد للمسند المذکور[1]

اور اگر وہ ضعیف ہے تو مذکورہ حدیث متصل کے لئے قوت بخش ہے۔

معلوم ہوا کہ حدیث مبہم دوسری روایت کو قوت بخشنے کی بھی صلاحیت رکھتی ہے۔ باطل و موضوع ہونا تو بہت دور کی بات ہے۔

حدیث مرسل کا حکم

مؤلف سیرۃ النبی کے عجائب و غرائب کا کوئی شمار نہیں۔ حدیث مرسل جو احناف اور جمہور فقہا کے نزدیک احکام میں بھی مقبول ہے وہ ان کے نزدیک فضائل میں معتبر نہیں۔ اس سے عجیب تر یہ کہ حدیث صحابی بھی ان کے نزدیک مرسل و نامعتبر ہوتی ہے[2] جبکہ ارسال صحابی بالاجماع حکم اتصال رکھتا ہے۔

(۱) مولانا علی قاری مرقاۃ میں فرماتے ہیں:۔

قال ابوداؤد ھذا مرسل۔ ای نوع مرسل وھو المنقطع۔ لکن المرسل حجۃ عندنا وعند الجمہور[3]۔ (ص ۳۹۳ ج ۴ فتاوی رضویہ)

ابوداؤد نے فرمایا یہ مرسل ہے۔ یعنی مرسل کی ایک قسم منقطع ہے۔ لیکن مرسل ہمارے نزدیک اور جمہور کے نزدیک حجت ہے۔

(۲) امام ابن امیر الحاج حلیہ میں فرماتے ہیں:۔

لایضرہ ذالک فان المنقطع کالمرسل فی قبولہ من الثقات۔

یہ مضر نہیں ہے کیونکہ منقطع مرسل ہی کی طرح ہے کہ ثقات سے ہو تو مقبول ہے۔

(۳) امام محمد ابن الھمام فتح القدیر میں فرماتے ہیں:۔

ضعف بالانقطاع وھو

اس حدیث کو منقطع ہونے کے باعث

---

[1] امام جلال الدین سیوطی:۔ تعقبات علی الموضوعات باب الحج۔ حدیث "دعا لامتہ عشیۃ عرفۃ بالمغفرۃ"۔ [2] سیرۃ النبی سوم ص ۶۲، طبع چہارم۔ [3] مرقاۃ

عندنا کالارسال بعد عدالۃ الرواۃ وثقتھم لایضر۔

ضعیف کہا گیا مگر ہمارے نزدیک انقطاع ارسال ہی کی طرح ہے کہ راوی کے عادل و ثقہ ہونے کے بعد مضر نہیں۔

اور بعض جو مرسل کو ضعیف مانتے ہیں وہ بھی اسے فضائل میں معتبر جانتے ہیں۔

(۴) مرقاۃ میں امام ابن حجر مکی شافعی سے منقول ہے۔

لایضرہ ذالک فی الاستدلال بہ ھھنا لان المنقطع یعمل بہ فی الفضائل اجماعا۔

یہ امر یہاں استدلال میں مضر نہیں کیونکہ منقطع پر فضائل میں تو "بالاجماع" عمل کیا جاتا ہے۔

دیگر ضعیف احادیث بھی فضائل میں معتبر ہیں

منقطع تو اکثر کے نزدیک ضعیف بھی نہیں۔ حدیث اگر مضطرب بلکہ منکر ہو تو بھی موضوع نہیں اور فضائل میں مقبول ہے۔ تعقبات سیوطی (فی آخر الجنائز) میں ہے۔

المضطرب من قسم الضعیف لا الموضوع۔

مضطرب بھی ضعیف ہے، موضوع نہیں۔

اسی میں ہے:۔

المنکر من قسم الضعیف وھو محتمل فی الفضائل۔

منکر از قسم ضعیف ہے۔ اور فضائل میں معتبر ہے۔

یہاں تک کہ جسے امام بخاری نے منکر الحدیث فرمایا ہو اس کی روایت بھی موضوع نہیں ضعیف ہی ہے حالانکہ امام بخاری فرماتے ہیں۔ میں جسے منکر کہوں اس سے روایت حلال نہیں[1] دیکھئے تعقبات علی الموضوعات باب فضائل القرآن میں ہے۔

---

[1] میزان الاعتدال، ذہبی۔ ذکر ابان بن جبلہ۔ وسلیمان بن داؤد الیمانی۔

قال البخاری منکر الحدیث فغایۃ امر حدیثہ ان یکون ضعیفا [1]

امام بخاری نے کہا... منکر الحدیث ہے تو زیادہ سے زیادہ اس کی حدیث ضعیف ہوگی موضوع نہیں۔

راوی کا مجہول و مبہم ہونا تو درکنار سخت سخت اقسام جرح جن میں ہر ایک جہالت راوی سے بدرجہا بدتر ہے۔ ان میں علما کی یہی تصریح ہے کہ ان سے موضوع ہونا لازم نہیں آتا۔ مثلاً راوی کی اپنی مرویات میں ایسی غفلت کہ دوسرے کی تلقین قبول کرلے یعنی دوسرا جو بتادے کہ تو نے یہ سنا تھا وہی مان لے۔ ظاہر ہے کہ یہ شدتِ غفلت کی پیداوار ہے۔ اور غفلت کا طعن فسق سے بھی بدتر اور جہالت سے تو چار درجہ زیادہ سخت ہے۔

امام ابن حجر عسقلانی نے نخبۃ الفکر میں اسبابِ طعن کی دس قسمیں کیں اور فرمایا کہ ہر پہلا دوسرے سے سخت ہے۔

① کذب کہ معاذ اللہ قصداً حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر افترا کرے۔
② تہمتِ کذب۔ راوی کی ایسی حدیث جو اس کے سوا دوسرے نے روایت نہ کی قواعد دینیہ کے مخالف ہو یا "اپنے کلام میں" جھوٹ کا عادی ہو۔
③ کثرت غلط ④ غفلت ⑤ فسق ⑥ وہم ⑦ مخالفت ثقات ⑧ جہالت (مجہول ہونا) ⑨ بدعت (بدمذہب ہونا) ⑩ سوء حفظ۔

علما فرماتے ہیں ایسے غافل شدید الطعن کی حدیث بھی موضوع نہیں۔ اواخرِ تعقبات میں ہے۔

فیہ یزید بن ابی زیاد وکان یلقن فیتلقن قلت ھذا

اس سند میں یزید بن ابی زیاد ہے جو دوسرے کی تلقین قبول کرلیتا تھا میں کہتا

[2] تعقبات علی الموضوعات۔ امام جلال الدین سیوطی۔

لا یقتضی الحکم بوضع حدیثہ [1]

ہوں یہ اس کا مقتضی نہیں کہ اس کی حدیث کو موضوع کہا جائے۔

ضعیفوں میں سب سے بدتر درجہ متروک کا ہے جس کے بعد صرف متہم بالوضع یا کذاب دجال کا مرتبہ ہے [2] پھر بھی علماء نے تصریح فرمائی کہ متروک کی حدیث بھی صرف ضعیف ہی ہے [3]

فتاوی رضویہ دوم میں امام احمد رضا قادری بریلوی قدس سرہ فرماتے ہیں — یہ ارشادات تو ہمارے علما رحمہم اللہ کے تھے۔ ایک قول وہابیہ کے امام شوکانی کا بھی لیجئے۔

موضوعات ابوالفرج (علامہ ابن الجوزی) میں یہ حدیث کہ جب مسلمان کی عمر چالیس برس کی ہوتی ہے اللہ تعالیٰ جنون و جذام و برص کو اس سے پھیر دیتا ہے۔ اور پچاس سال والے پر حساب میں نرمی اور ساٹھ سال والے کو توبہ و عبادت نصیب ہوتی ہے۔ ستر سالہ کو اللہ عزوجل اور اس کے فرشتے دوست رکھتے ہیں۔ اسی برس والے کی نیکیاں قبول اور برائیاں معاف۔ نوے برس والے کے سب اگلے پچھلے گناہ مغفور ہوتے ہیں۔ وہ زمین پر اللہ عزوجل کا قیدی کہلاتا ہے اور اپنے گھر والوں کا شفیع کیا جاتا ہے" — بطرق عدیدہ روایت کرکے اس کے راوی پر طعن کئے کہ یوسف بن ابی درہ راوی مناکیر لیس بشئ ہے۔ اور فرج ضعیف منکر الحدیث کہ واہی حدیثوں کو صحیح سندوں سے ملا دیتا ہے۔ اور محمد بن عامر حدیثوں کو پلٹ دیتا ہے، ثقات سے وہ روایتیں کرتا ہے جو ان کی حدیث سے نہیں — اور عزرمی متروک اور عباد بن عباد مستحق ترک — اور عزرہ کو یحیی بن معین نے ضعیف بتایا۔ اور ابوالحسن کوفی مجہول — اور عاتکہ ضعیف ہے۔ شوکانی نے ان سب مطاعن کو نقل کرکے کہا۔

ھذا غایۃ ما ابدی

یعنی ابن جوزی نے جو اس حدیث پر

[1] فتاوی رضویہ دوم [2] میزان الاعتدال۔ شمس الدین ذہبی
[3] تقریب التہذیب۔ ابن حجر عسقلانی لآلی مصنوعہ ..... تعقبات۔

ابن الجوزی دلیلا علی ما حکم بہ من الوضع، وقد افرط وجازف، فلیس مثل ھذہ المقالات توجب الحکم بالوضع. بل اقل احوال الحدیث ان یکون حسنا لغیرہ (ص۳۹۷ ج ۲ فتاوی رضویہ)

حکم وضع کیا اس کی دلیل میں انتہا درجہ یہ طعن پیدا کئے اور بے شک وہ حد سے بڑھے اور بے باکی کو کام میں لائے کہ ایسے طعن حکم وضع کے موجب نہیں بلکہ کم درجہ حال اس حدیث کا یہ ہے کہ "حسن لغیرہ" ہو۔

ساتویں بحث موضوع ہونا کیسے ثابت ہوتا ہے؟

امام احمد رضا قادری منیر العین میں فرماتے ہیں:۔

غرض ایسے وجوہ سے حکمِ وضع کی طرف راہ چاہنا محض ہوس ہے۔ ہاں موضوعیت یوں ثابت ہوتی ہے کہ:۔

(۱) اس روایت کا مضمون قرآن عظیم (۲) یا سنت متواترہ (۳) یا اجماع قطعی (تینوں) قطعیات الدلالہ (۴) یا عقل صریح (۵) یا حسِ صحیح یا تاریخ یقینی کے ایسا مخالف ہو کہ احتمالِ تاویل و تطبیق نہ رہے (۶) یا معنی شنیع و قبیح ہوں جن کا صدور حضور پرنور صلوات اللہ تعالیٰ علیہ سے معقول نہ ہو جیسے معاذ اللہ کسی فساد یا ظلم یا عبث یا سفہ یا مدحِ باطل یا ذمِ حق پر مشتمل ہونا۔

(۸) یا ایک جماعت ــــ جس کا عدد حدِ تواتر کو پہنچے، اور ان میں احتمالِ کذب یا ایک دوسرے کی تقلید کا نہ رہے، اس کے کذب و بطلان پر گواہی ــــ مستندًا الی الحس۔ دے۔

(۹) یا خبر کسی ایسے امر کی ہو کہ اگر واقع ہوتا تو اس کی نقل و خبر مشہور و مستفیض ہو جاتی، مگر اس روایت کے سوا اس کا کہیں پتہ نہیں۔

(۱۰) یا کسی حقیر فعل کی مدحت اور اس پر وعدہ و بشارت یا صغیر کی مذمت اور اس پر وعید و تہدید میں ایسے لمبے چوڑے مبالغے ہوں جنہیں کلام معجز نظام

ثبوت سے مشابہت نہ رہے۔

یہ دس صورتیں تو صریح ظہور و وضوح کی ہیں۔

(۱۱) یا یوں حکم وضع کیا جاتا ہے کہ لفظ رکیک و سخیف ہوں، جنہیں سمع، دفع اور طبع منع کرے۔ اور ناقل مدعی ہو کہ یہ بعینہا الفاظ کریمہ حضور افصح العرب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں۔ یا وہ محل ہی نقل بالمعنی کا نہ ہو۔

(۱۲) یا ناقل رافضی حضرات اہل بیت کرام علی سیدہم وعلیہم الصلوٰۃ والسلام کے فضائل میں وہ باتیں روایت کرے جو اس کے غیر سے ثابت نہ ہوں جیسے حدیث لحمک لحمی ودمک دمی۔

اقول:۔ انصافًا یوں ہی وہ مناقب امیر معاویہ و عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما کہ صرف نواصب کی روایت سے آئیں ــــ کہ جس طرح روافض نے فضائلِ امیر المومنین و اہل بیت طاہرین رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں قریب تین لاکھ حدیثوں کے وضع کیں، یوہیں نواصب نے مناقبِ امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں حدیثیں گڑھیں۔

(۱۳) یا قرائنِ حالیہ گواہی دے رہے ہوں کہ یہ روایت اس شخص نے کسی طرح یا غضب وغیرہ کے باعث ابھی گڑھ کر پیش کر دی ــــ جیسے حدیث سبق میں یا ذب جناح۔ اور حدیث ذم معلمین اطفال۔

(۱۴) یا تمام کتب و تصانیف اسلامیہ میں استقرائے تام کیا جائے اور اس کا کہیں پتہ نہ چلے ــــ یہ صرف اجلۂ حفاظ، ائمہ شان کا کام تھا، جس کی لیاقت صدہا سال سے معدوم۔

(۱۵) یا راوی خود اقرارِ وضع کر دے خواہ صراحۃً خواہ ایسی بات کہے جو بمنزلۂ اقرار ہو۔ مثلاً ایک شیخ سے بلا واسطہ بدعوی سماع روایت کرے پھر اس کی تاریخ وہ بتائے کہ اس کا اس سے سننا معقول نہ ہو۔

یہ پندرہ باتیں ہیں کہ شاید اس جمع و تلخیص کے ساتھ ان سطور کے سوا نہ ملیں۔ وہو

بسطنا المقال علی کل صورۃ لطال الکلام وتقاصی المرام ولسنا ھنالک بصدد ذالک[1]۔

اب رہا یہ سوال کہ جو حدیث ان پندرہ دلائل سے خالی ہو اسے موضوع کہنے کی رخصت کس حال میں ہے۔ اس باب میں کلماتِ علمائے کرام تین طرح ہیں۔

(۱) انکار محض: یعنی امور مذکورہ کے بغیر موضوع کہنے کا جواز بالکل نہیں۔ اگرچہ راوی وضاع کذاب ہی پر اس کا مدار ہو۔ امام سخاوی نے فتح المغیث شرح الفیۃ الحدیث میں اس پر جزم فرمایا۔

(۲) صرف ایسے وضاع کذاب کی حدیث کو موضوع کہیں گے جس سے قصداً نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر معاذ اللہ بہتان وافترا کرنا ثابت ہو۔ یہ بھی بطریق ظن نہ بطور یقین کہ بڑا جھوٹا بھی کبھی سچ بولتا ہے۔

اور اگر قصداً افترا اس سے ثابت نہیں تو اس کی حدیث موضوع نہیں اگرچہ متہم بکذب ووضع ہو۔ یہ مسلک امام الشان علامہ ابن حجر وغیرہ علما کا ہے ــــ اس کی نظیر یہ ہے کہ امام مالک نے خلیفہ منصور عباسی سے ارشاد فرمایا:۔

"اپنا منہ حضور پرنور شافع یوم النشور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کیوں پھیرتا ہے؟ وہ تیرا اور تیرے باپ آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اللہ عزوجل کی بارگاہ میں وسیلہ ہیں۔ ان کی طرف منہ کر۔ اور ان سے شفاعت مانگ کہ اللہ تعالیٰ ان کی شفاعت قبول فرمائے گا۔"

اسے اکابر ائمہ نے باسانید جیدہ مقبولہ روایت فرمایا۔ ابن تیمیہ متہوّر (بے باک) نے جزافاً (اٹکل سے) بک دیا کہ ان ھذہ الحکایۃ کذب علی مالک (یہ داستان امام مالک پر افترا ہے)

علامہ زرقانی نے اس کے رد میں فرمایا:۔ یہ عجیب تہوّر وبے باکی ہے۔ اس واقعہ کو ابوالحسن علی بن فہر نے اپنی کتاب فضائل مالک میں بسند جید روایت کیا۔ اور امام قاضی

[1] فتاوی رضویہ دوم ص ۳۹۷-۳۹۸ مطبوعہ دہلی۔

عیاض نے اپنے ثقات مشائخ میں سے متعدد شیوخ کے طریق سے اس کی تخریج فرمائی تو وہ کذب کیونکر ہے" جبکہ اس کی سند میں نہ کوئی وضاع ہے نہ کذاب"[1] (معلوم ہوا کہ صرف کذاب وضاع کی روایت کو موضوع کہیں گے)

(۳) بعض علما کہیں یوں فرماتے ہیں کہ یہ روایت موضوع تو جب ہوتی کہ اس کا راوی متہم بالکذب ہوتا۔ یہاں ایسا نہیں تو موضوع نہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان بعض حضرات کے نزدیک متہم بالکذب کی روایت کو کبھی موضوع کہہ سکتے ہیں)

بالجملہ اتنے پر اجماعِ محققین ہے کہ حدیث جب ان دلائل وقرائن قطعیہ وغالبہ سے خالی ہو اور اس کا مدار کسی متہم بالکذب پر نہ ہو تو ہرگز کسی طرح اسے موضوع کہنا ممکن نہیں۔ جو اس کے بغیر موضوع کہدے یا تو حد سے بڑھا ہوا شدت پرست ہے یا غلط کار خاطی یا مغالطہ دہِ متعصب۔ واللہ الھادی[2]

آٹھویں بحث۔ حکم وضع سند پر ہوتا ہے اصل حدیث پر نہیں

جو حدیث ان پندرہ دلائل سے پاک ہو محدث اگر اس کو موضوع کہتا ہے تو اس سے خود حدیث پر حکم لازم نہیں بلکہ اس سند پر جو اس وقت اس کے پیش نظر ہے بلکہ بارہا ایسا بھی ہوتا ہے کہ متعدد پیش نظر سندوں میں سے صرف ایک سند پر حکم ہوتا ہے یعنی حدیث اگرچہ فی نفسہ ثابت ہے مگر اس سند سے موضوع وباطل ہے۔

اسی طرح اگر محدث کسی حدیث کو ضعیف کہے تو یہ حکم بھی نفس حدیث پر لازم نہیں بلکہ اس سند پر جو اس کے پیش نظر ہو۔ لہٰذا ہو سکتا ہے کہ اصل حدیث اعلیٰ درجہ کی صحیح ہو اور اس کی کسی سندِ ضعیف پر محدث حکم ضعف لگاتے ہوئے کہے کہ یہ ضعیف ہے۔

[1] امام عبدالباقی زرقانی مالکی۔ شرح مواہب لدنیہ۔ مقصد عاشر فصل ثانی۔

[2] فتاوی رضویہ امام احمد رضا قادری ج ۲ ص ۳۹۸ تا ۴۰۱ ملخصاً موضحاً۔

ائمہ حدیث ان مضامین کی تصریحیں فرما چکے ہیں لہٰذا کسی عالم کا حکمِ وضع یا حکم ضعف دیکھ کر خواہی نخواہی یہ سمجھ لینا کہ اصل حدیث باطل یا ضعیف ہے ناواقفوں کی فہمِ سخیف ہے[1]۔

اس اصول کی صرف دو زبردست مثالیں نقل کی جاتی ہیں۔

(۱) میزان الاعتدال فی نقد الرجال للذہبی میں ہے۔

ابراھیم بن موسیٰ المروزی عن مالک عن نافع عن ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما حدیث:۔ طلب العلم فریضۃ قال احمد بن حنبل ھذا کذب یعنی بھذا الاسناد۔ والا فالمتن لہ طرق ضعیفۃ۔

یعنی امام احمد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو حدیث طلب العلم فریضۃ کو کذب فرمایا اس سے مراد یہ ہے کہ خاص اس سند سے کذب ہے ورنہ اصل حدیث تو کئی ضعیف سندوں سے وارد ہے۔

(۲) حدیث۔ صلوٰۃ بسواک خیر من سبعین صلوٰۃ بغیر سواک۔

مسواک کے ساتھ نماز بے مسواک کی ستر نمازوں سے بہتر ہے۔

ابو نعیم نے کتاب السواک میں دو جید و صحیح سندوں سے روایت کی۔ امام ضیا نے اسے صحیح مختارہ اور حاکم نے صحیح مستدرک میں داخل کیا اور کہا شرط مسلم پر صحیح ہے۔ امام احمد و ابن خزیمہ و حارث بن ابی اسامہ و ابو یعلیٰ و ابن عدی و بزار و حاکم و بیہقی و ابو نعیم وغیرہم اجلۂ محدثین نے بطرقِ عدیدہ و اسانیدِ متنوعہ احادیث ام المؤمنین صدیقہ و عبداللہ بن عباس و عبداللہ بن عمرو جابر بن عبداللہ و انس بن مالک و ام الدرداء وغیرہم رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے تخریج کی۔ جس کے بعد حدیث پر حکمِ بطلان قطعاً محال۔

---

[1] امام احمد رضا قادری۔ فتاویٰ رضویہ ج ۲ ص ۴۰۱ ملخصاً موضحاً۔

بایں ہمہ ابو عمر ابن عبدالبر نے تمہید میں امام ابن معین سے اس کا بطلان نقل کیا۔ علامہ شمس الدین سخاوی مقاصد حسنہ میں اسے ذکر کر کے فرماتے ہیں:۔

قول ابن عبدالبر فی التمہید عن ابن معین انہ حدیث باطل وھو بالنسبۃ لما وقع لہ من طرقہ۔

امام ابن معین کا یہ فرمانا اس سند کی نسبت ہے جو انہیں پہنچی۔ (ورنہ حدیث باطل تو کیا معنی ضعیف بھی نہیں۔ کم سے کم "حسن ثابت" ہے)[1]

یہاں تک اصولی بحثیں کی گئی ہیں — جن سے دورِ جدید کے خود ساختہ محققین کی بے اصولیوں کا پردہ فاش ہوتا ہے۔ اور روایات پر صحیح تنقید اور غلط تنقید میں امتیاز کے پیمانے معلوم ہوتے ہیں۔ ان مباحث کو ذہن نشین رکھا جائے تو بہت سی بے جا تنقیدوں کا محاسبہ خود ہی کیا جا سکتا ہے۔

آئندہ صفحات میں بطور مشتے نمونہ از خروارے چند تنقیدوں کا مفصل محاسبہ کیا جاتا ہے جس سے اہل انصاف اور ارباب نظر کو بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ فضائل اور معجزات کی معتبر روایات کو بے اعتبار ٹھہرانے کے لئے کیسی کیسی صریح خیانتوں کو روا رکھا گیا ہے۔ اور علم و تحقیق کا نام کیسی ناروا جسارت کے ساتھ داغ دار کرنے کی سعیِ پُر فریب کی گئی ہے والعیاذ باللہ۔

---

[1] امام احمد رضا قادری۔ فتاویٰ رضویہ ج ۲ ص ۴۰۱ - ۴۰۲ ملخصاً موضحاً۔

روایاتِ معجزات کی تنقیح

اب ہم مؤلف سیرۃ النبی کے خود ساختہ اصولوں کی بھرپور تردید اور اصولِ مسلمہ کی تحریر کے بعد ان روایات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جن کو مؤلف نے بے اعتبار ثابت کرنے کی سعی لاحاصل کی ہے اجمالی طور سے ان روایات کا یہ حال ہے کہ ان میں بعض اعلیٰ درجہ کی صحیح روایات ہیں جن کو مؤلف نے فضائل دشمنی کے نتیجے میں بے اعتبار ٹھہرانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ مثلاً بھیڑیے کی گفتگو کا واقعہ۔ دوسری بعض احادیث جو حسن ہیں۔ اصول کے ذیل میں بیان ہو چکا ہے کہ حدیثِ حسن فضائل ہی نہیں بلکہ احکام میں بھی معتبر ہے بعض احادیث یقیناً ضعیف ہیں۔ خود مصنفینِ سیر و حدیث نے انکے ضعف کی تصریح کر دی ہے۔ مگر واضح ہو چکا کہ حدیث ضعیف حتیٰ کہ منکر و متروک بھی فضائل میں بالاجماع معتبر ہے۔ اب اگر کوئی اپنا اصول یہ بنالے کہ فضائل میں بھی حدیث ضعیف کا اعتبار نہیں تو یہ اس کے فہم و علم کا قصور اور فضائل دشمنی کا فتور ہے۔ محدثین کرام کا دامن اس بدنما داغ سے پاک ہے۔

بیان ہو چکا کہ اس طرح اصول سازی کا دروازہ کھولنے کی اگر آج کے نام نہاد محققوں کو اجازت ہو تو کوئی محقق یہ بھی فرما سکتا ہے کہ "سارا دفترِ احکام و فقہ بالکل بے سروپا ہے۔ کار ہے کسی حکم کے لئے ایسی حدیث ضروری ہے جو قطعی و یقینی اور متواتر ہو یا ایسی آیت چاہئے جو ہر شک و شبہ سے بالاتر اور بالکل مفسر و محکم ہو۔ افسوس کہ تمام فقہائے اسلام حتیٰ کہ ائمہ اربعہ ابو حنیفہ و مالک، شافعی و احمد بن حنبل نے بھی دربارۂ احکام حدیث کا صرف صحیح ہو جانا کافی سمجھا ہے حالانکہ احکام کا مرتبہ اس سے بالاتر ہے"؟

بتلایئے اس اصول کے پیشِ نظر بخاری و مسلم کی بھی خیر رہ جائے گی؟ اور کوئی بھی مسلمان باعمل ہو کر جینے کے قابل رہ جائے گا؟ کتنے احکام ہیں جو حدیث متواتر اور نص قطعی سے ثابت ہیں؟

میرا مقصد یہ ہے کہ ان نئے محققین بلکہ دین کے مبتدع موجدین کے دلآویز الفاظ پر ریجھنا ارباب علم و فن کا کام نہیں ان حضرات نے ایسے اصول کا دروازہ کھول رکھا ہے جن کی ضرب دین و ملت کی ساری بنیادوں پر پڑتی ہے۔ اور جن کے تحت احکام و عقائد کی ساری آساسیں ڈھانے کا راستہ نکلتا ہے۔ والعیاذ باللہ تعالیٰ۔

ہاں مؤلف نے معجزات کی بعض روایات کو موضوع کہنے کی بھی جسارت کی ہے مگر کوئی دلیل نہ دے سکے کہ آخر موضوع کیسے ہے؟ اس کی سند میں کوئی کذاب و وضاع ہے یا اس کا متن ان پندرہ قرائن یقینیہ اکثریہ کا حامل ہے جن کی بنا پر کسی روایت کو موضوع کہا جا سکتا ہے! کوئی سند کوئی دلیل نہیں۔ بس یہ فرمانا کافی سمجھا کہ "بے سروپا ہے۔ موضوع ہے۔ بے اصل ہے"۔

اگر یوں بلا دلیل کہنے کی اجازت ملے تو کوئی بھی بخاری و مسلم کی صحیح احادیث کو موضوع کہہ سکتا ہے دلیل طلب کی جائے تو بس یہ جواب کافی ہے کہ میرا ذوق تحقیق یہ کہتا ہے کہ "موضوع ہے"[1] کیا خوب!

گر ہمیں مفتی و ملا کار ایماں خراب خواہد شد

روایات پر طعن :۔ اب دیکھئے کیا فرماتے ہیں۔

> "دلائل و معجزات کے باب میں موضوع و منکر، ضعیف غرض ہر قسم کی قابل اعتراض روایات کا اتنا بڑا انبار ہے کہ ایک ایک کر کے اسکی جانچ پڑتال کیجائے تو ایک مستقل ضخیم جلد تیار ہو جائے"[2]۔

---

[1] شق صدر کی ایک روایت جو صحیح مسلم میں بروایت صحیحہ مروی ہے اسے رد کرنے کے لئے مؤلف نے یہی ارشاد فرمایا ہے میرا میلان تحقیق یہ ہے الخ ص۴۹۶ ج ۳۔

[2] سلیمان ندوی :۔ سیرۃ النبی ج ۳ ص ۳۷، طبع چہارم معارف اعظم گڑھ۔

کوئی مستقل ضخیم جلد تیار کر دینا تو یقیناً آپ کی یاوہ گوئی سے کوئی بعید نہیں۔ مگر اس باب میں کوئی محقق و مسلم کتاب لکھنا یقیناً آپ کی ذات سے محال ہے۔ صرف چند روایات کی تنقید میں تو وہ وہ کرشمے دکھائے ہیں کہ الامان والحفیظ۔ اگر ایک ضخیم جلد تیار کرتے تو کیا حال ہوتا۔

ابن الجوزی جیسے علامۂ مدقق نے موضوعات میں ایک ضخیم جلد تیار کی اور بھی بعض علما نے اس طرح کی کوشش کی، ان کی نیتوں پر حملہ نہیں کیا جا سکتا مگر کتنی صحیح و حسن روایات کو بے اعتبار لکھ گئے، کتنی ضعیف احادیث کو موضوع کہہ گئے۔ یہ التعقبات علی الموضوعات، اللآلی المصنوعہ فی الاحادیث الموضوعہ، القول المسدد فی الذب عن مسند احمد اور موضوعات کبیر وغیرہ دیکھنے والوں کی نظر سے مخفی نہیں۔

چودھویں صدی کا نام نہاد محقق جس کے پیش نظر امام بیہقی کی دلائل النبوۃ اور شعب الایمان بھی نہیں، ابو یعلی، ابن راہویہ، ابن ابی شیبہ بزار وغیرہم محدثین کی مسانید و تصانیف بھی نہیں[1] امام عبدالرزاق کی مصنف کے بارے میں یہ بھی صحیح خبر نہیں کہ اس کی کل کتنی جلدیں ہیں اگر وہ نقد و جرح پر کمر ہمت باندھے اور احادیث کو بے اعتبار ٹھہرانے کی ٹھانے تو سوائے اس کے کہ حسب عادت محض اٹکل سے موضوع و بے اصل، بے سند و بے اعتبار کہتا جائے۔ اس کے پاس تحقیقی اور قابل اعتنا سرمایہ بہت کم فراہم ہو سکے گا۔

مزید فرماتے ہیں:۔

[1] بالفرض اگر سب فراہم بھی ہو جائیں تو سب کی سندوں پر ہمہ گیر نظر، پھر سب کے رجال پر اقوال علماء کا استیعاب کارے دارد۔ اس دور کے حافظہ کا جو حال ہے وہ مخفی نہیں علامہ ابن الجوزی کی وسعت حافظہ کے عشر عشیر کو بھی نہیں پہونچتا۔ مزید برآں مؤلف کو خود اعتراف ہے کہ کئی صدیوں کے رجال کے بارے میں کتابوں کے اندر کوئی مواد ملتا ہی نہیں کہ وہ کیسے تھے؛ پھر جرح و تنقید کیا ہوگی؟
ایں خیال است و محال است و جنوں

ہم صرف ان روایتوں کی تنقید پر قناعت کرتے ہیں جو عام طور سے ہمارے ملک میں مشہور ہیں، اور میلاد کی محفلوں میں ان کو بصد شوق و ذوق پڑھا اور سنا جاتا ہے[1]

معتبر روایات کو اگر میلاد کی محفلوں میں بصد شوق و ذوق پڑھا جاتا ہے تو اس میں آپ کا کیا نقصان ہے؟ سوائے اس کے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و مناقب کا چرچا ہوتا ہے جو آپ کے دین کی اصل الاصول کے خلاف ہے مگر اس میں ہمارا کیا قصور ہے یہ تو آپ کے مذہب کا کرشمہ ہے جس میں تعظیم رسول شرک ہے ہمارے علما تو بہت پہلے لکھ چکے ؎

شرک ٹھہرے جس میں تعظیم رسول　　اُس بُرے مذہب پہ لعنت کیجئے

ہاں آپ کے نزدیک یہ روایات بے اعتبار ہیں جس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ وہ فضائل رسول سے تعلق رکھتی ہیں اور ظاہری وجہ جو آپ سپرد قلم فرما رہے ہیں اسے ذرا ہم بھی دیکھیں علما کے مسلّم اصولوں سے کہاں تک ہم آہنگ ہے۔

(۱)

چونکہ یہ حضرات ہمارے آقا سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے جیسا بشر سمجھتے ہیں اور بڑا بھائی کہتے ہیں اس لئے نورانیت مصطفےٰ علیہ التحیۃ والثناء سے انہیں پورا عناد ہے۔

روایات تنقیح میں مؤلف نے سب سے پہلے اول ماخلق اللہ نوری کو لکھا ہے اسپر یہ جرح فرمائی ہے کہ "اس روایت کا پتہ احادیث کے دفتر میں مجھے نہیں ملا"[2]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلی دوسری صدی سے لے کر چودھویں صدی تک کی تمام احادیث ان کے دفتر میں موجود تھیں اور سب انہوں نے چھان ماریں جبکہ

[1] ایضاً سیرۃ النبی ج ۳ ص ۷۳۷۔

[2] سیرۃ النبی ۳/ ۷۳۷۔

حال یہ ہے کہ حدیث کی کتنی متداول کتابیں جو خود مؤلف کے عہد تالیف میں اسی ہندوستان کے اندر مخطوطہ یا مطبوعہ شکل میں دستیاب تھیں وہ بھی ان کے کتب خانہ میں نہیں۔ وہ احادیث جو اول ماخلق اللہ نوری کو ماننے والے علمائے کرام کی دسترس میں تھیں اور مؤلف کے حاشیۂ خیال تک بھی نہ پہنچیں ان کا تو شمار ہی نہیں۔

مزید جرح حاشیے میں فرماتے ہیں: "جو علما ہر قسم کی روایت میں صحت کے پہلو کا خیال ضروری سمجھتے ہیں ان کو اس میں کلام ہے"۔[1]

دنیا کے علماء کا کون سا طبقہ ہے جو ہر قسم کی روایت میں "صحیح" ہونا ضروری سمجھتا ہے آخر ان کی نشان دہی تو فرمائی ہوتی؛ ہم تو دیکھتے ہیں کہ تمام علما ہر باب کے لحاظ سے احادیث کی بھی تقسیم کرتے ہیں اور ہر باب کے لائق 'متواتر، صحیح اور ضعیف احادیث تک بالاجماع معتبر قرار دیتے ہیں اس کے پیش نظر آپ کی نقل مجہول کا کوئی وزن نہیں رہ جاتا بلکہ اگر اسے تدلیس کی بدترین نوع تلبیس و فریب کا نام دیا جائے تو بے جا نہیں۔

پھر آنجناب یہ بھی نہیں بتلاتے کہ کسی عالم نے اگر اول ماخلق اللہ نوری میں کلام کیا تھا تو آخر وہ کلام کیا ہے، کیا کسی نے اسے موضوع کہا ہے؟

آگے لکھتے ہیں:۔

"البتہ ایک روایت مصنف عبدالرزاق میں ہے۔ یاجابر اول ماخلق اللہ نور نبیک من نورہ۔ اے جابر سب سے پہلے خدا نے تیرے پیغمبر کا نور اپنے نور سے پیدا کیا الخ"[2]

چونکہ معتمد علمائے کرام نے اس حدیث کو اعتبار کے ساتھ نقل کیا ہے اس لئے اس پر جرح کی اور کوئی گنجائش نہیں ملی تو یہ لکھتے ہیں کہ افسوس کہ علما نے اسے بے سند نقل کیا ہے اور مصنف کی ایک ہی جلد ہمارے پاس ہے دوسری جلد ملتی نہیں۔ ان کے خیال میں

[1] ایضاً حاشیہ ۷۳۷ [2] ایضاً ص ۷۳۸

مصنف کی صرف دو ہی جلدیں تھیں) چونکہ کتاب مذکور میں صحیح حدیثوں کے ساتھ ساتھ موضوع حدیثیں تک موجود ہیں۔ اور فضائل و مناقب میں اس کی روایتوں کا اعتبار کم کیا جاتا ہے۔ اس لئے اصولی حیثیت سے اس حدیث کو تسلیم کرنے میں مجھے پس و پیش ہے"۔ تمام علما قبول کریں مگر آپ کو قبول نہیں محض اس لئے کہ اس کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و مناقب سے ہے۔ مزید برآں یہ بھی لکھ گئے کہ۔

"فضائل و مناقب کے باب میں روایات مصنف کا اعتبار کم ہے"۔

وہ کون حضرات ہیں جنہوں نے مصنف عبدالرزاق تو درکنار میں کہتا ہوں کسی بھی متداول کتاب کی احادیث کو مطلقاً بے اعتبار ٹھہرایا ہو۔ فرض کر لیجئے کہ اس میں موضوع حدیثیں بھی بے شمار ہیں تو کیا اس کی بنا پر اس کی ہر روایت موضوع ہو جائیگی؟

میں لکھ چکا ہوں کہ صحیح مسلم کی بعض حدیثوں کو بھی ابن حزم نے موضوع کہا۔ سنن اربعہ ابوداؤد، ترمذی، نسائی و ابن ماجہ کی سیکڑوں حدیثیں ہیں جن پر محدثین کو کلام ہے اور صراحۃً ان پر جرحیں کی ہیں اور صحیح جرحیں کی ہیں تو کیا اس سے ان کتابوں کی ساری حدیثیں بے اعتبار اور کم از کم باب احکام میں بے کار ہو جائیں گی؟

آگے انہوں نے حضرت آدم علیہ السلام کے وجود گرامی سے پہلے نور مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے موجود ہونے کو بھی موضوع[1] اور بے سروپا کہہ ڈالا ہے جب کہ اس سے پہلے حاشیہ میں یہ لکھ چکے ہیں کہ "البتہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا تمام انبیا میں اول مخلوق ہونا ثابت ہے"[2]

کیا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا تمام انبیا میں اول مخلوق ہونا اس طرح ہے کہ یہی وجود گرامی جو مکہ و مدینہ کی سرزمین پر رسول برحق بن کر مبعوث ہوا بعینہٖ وہی تمام انبیا سے پہلے پیدا ہو چکا تھا؟

[1] ایضاً ص ۷۳۹ [2] ایضاً ص ۷۳۷

دنیا کا کون سا عاقل ہے جو اس وجود پاک کو حضرت آدم سے پہلے کہے جو تمام انبیاء کرام حتیٰ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بھی سیکڑوں برس بعد بطنِ آمنہ رضی اللہ عنہا سے پیدا ہوا؟ اور حضرت آمنہ ابوالبشر علیہ السلام کی بیٹی ہیں، دادی نہیں! ماننا پڑے گا کہ جب حضور انور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حضرت آدم علیٰ نبینا و علیہ السلام سے بھی پہلے پیدا ہو چکے تھے تو اس وقت حضور کے وجود پاک کی نوعیت کچھ اور تھی اور یہ نوعیت وہی ہے جس کو صریح احادیث بتا رہی ہیں کہ سرکار بشکل نور تھے، لہٰذا قبلِ آدم نورِ گرامی کے موجود ہونے کو بھی بے سروپا اور موضوع کہنا خود بے سروپا اور باطل و موضوع ہے ؏

مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری

اولیتِ نورِ محمدی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حدیث کو ناقابلِ قبول دکھانے کے لئے ایک فریب یوں دیتے ہیں :۔

" اس تردد کو قوت اس سے اور بھی زیادہ ہوتی ہے کہ صحیح احادیث" میں مخلوقات الٰہی میں سب سے پہلے "قلمِ تقدیر" کی پیدائش کا تصریحی بیان ہے کہ اول ماخلق اللہ القلم ـــــ جامع ترمذی کتاب القدر[1]

گویا فرمانا یہ چاہتے ہیں کہ کائنات میں سب سے پہلے نورِ محمدی کہاں پیدا ہوا صحیح حدیثیں تو یہ بتا رہی ہیں کہ سب سے پہلے قلم پیدا ہوا۔

سبحان اللہ! قلمِ تقدیر اور نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم پر اولیت، معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف کو یہ بھی خبر نہیں کہ جمہور علماء کرام "قلم تقدیر کی اولیت کے قائل نہیں۔ یا پھر جان بوجھ کر نظر عوام میں اولیتِ نورِ گرامی کو باطل ٹھہرانے کی تدبیر نکالی ہے؟ کسی طرح تو اس حدیثِ معتبر سے پیچھا چھوٹے جس میں صراحۃً یہ فرمان موجود ہے کہ۔

یا جابر ان اللہ تعالیٰ قد خلق قبل الاشیاء نور نبیك من نورہ۔

اے جابر بیشک اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں سے پہلے تیرے نبی کا نور اپنے نور سے پیدا فرمایا"

[1] ایضاً ۷۳۸

یہ حدیث بہت مفصل ہے اس میں یہ بھی صراحت ہے کہ قلم وغیرہ تمام چیزیں اسی نور سے پیدا ہوئیں۔ قلم اول مخلوق نہیں اس سلسلہ میں دیگر علماء کے اقوال سے پہلے میں خود مؤلف کے مستند علامہ ابن کثیر کی صراحت نقل کرتا ہوں وہ البدایہ والنہایہ میں لکھتے ہیں۔

والذی علیہ الجمہور فیما نقلہ الحافظ ابو العلاء الہمدانی وغیرہ ان العرش مخلوق قبل ذالك۔	جمہور کا مذہب یہ ہے کہ عرش قلم سے پہلے پیدا کیا گیا ہے جیسا کہ حافظ ابوالعلاء ہمدانی وغیرہ نے نقل کیا ہے۔

پھر اس کے ثبوت میں امام ابن جریر کی روایت بطریق ضحاک عن ابن عباس اور امام مسلم کی روایت از عبداللہ بن عمرو بن العاص پیش کرتے ہیں۔

قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یقول کتب اللہ مقادیر الخلائق قبل ان یخلق السمٰوات والارض بخمسین الف سنۃ قال وعرشہ علی الماء۔	حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ نے مخلوقات کی تقدیریں آسمان و زمین کی تخلیق سے پچاس ہزار برس پہلے لکھیں اس وقت عرش پانی پر تھا۔

آگے لکھتے ہیں :۔

وقد دل ھذا الحدیث ان ذلك بعد خلق العرش فثبت تقدیم العرش علی القلم الذی کتب بہ المقادیر کما ذھب الیہ الجماھیر۔	اس حدیث سے پتہ چلا کہ یہ تخلیقِ عرش کے بعد ہوا تو قلم تقدیر پر عرش کی تقدیم ثابت ہوئی جیسا کہ مذہب جمہور ہے۔
ویحمل حدیث القلم علی انہ اول المخلوقات من ھذا العالم ویؤید ھذا ما رواہ البخاری عن	حدیثِ قلم کا مطلب یہ ہوگا کہ "اس عالم میں" سب سے پہلی مخلوق قلم ہے اسی کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو

عمران بن حصینؓ۔ (البدایۃ والنہایۃ ص ۹ ج ۱)

امام بخاری نے عمران بن حصین سے روایت ہے۔

مزید برآں "وعرشہ علی الماء" سے جس طرح عرش کی تقدیم معلوم ہوتی ہے پانی کی تقدیم بھی اس سے پہلے ثابت ہوتی ہے چنانچہ مولانا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے دونوں کی تقدیم کو ایک ساتھ ذکر کیا ہے پھر وہ ازہار کے حوالہ سے اس کی صراحت نقل کرتے ہیں کہ قلم کا اول مخلوق ہونا عرش، پانی اور ہوا کے بعد ہے ہوا کی تقدیم سے متعلق حضرت ابن عباس کی روایت پیش کرتے ہیں کہ ان سے ارشاد باری وکان عرشہ علی الماء کے متعلق سوال ہوا کہ پانی کس چیز پر تھا؟ انہوں نے فرمایا پشت ہوا پر[1]

حاصل کلام یہ کہ پوری کائنات میں سب سے پہلی مخلوق قلم بہرحال نہیں، صریح و صحیح احادیث سے اس کی نفی ثابت ہو چکی ہے، البتہ نور محمدی کا سب سے اول ہونا ثابت ہے۔ اسی لئے مواہب و شرح مواہب للزرقانی میں اختلافِ اوّلیت اس طرح نقل کیا ہے۔

وقد اختلف هل القلم اول المخلوقات بعد النور المحمدی فقال الحافظ ابو یعلی الهمدانی الاصح وهو مذهب الجمهور۔ ان العرش خلق قبل القلم لما ثبت فی الصحیح الخ

اختلاف یہ ہے کہ نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کیا قلم پہلی مخلوق ہے۔ حافظ ابو یعلی ہمدانی نے فرمایا اصح اور مذہب جمہور یہ ہے کہ عرش قلم سے پہلے پیدا ہوا جیسا کہ حدیث صحیح سے ثابت ہے۔

پھر قلم، عرش وغیرہ کی تخلیق سے متعلق احادیث نقل کر کے فیصلہ یہ فرماتے ہیں۔

فیجمع بینه وبین ما قبله من حدیثی جابر و ابی

یہ روایت اور اس سے پہلے حضرت جابر کی حدیث نوری اور ابو رزین کی حدیث

[1] مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح۔ علامہ علی قاری ت/۱۰۱۴ھ ج ۱ ص ۱۲۲ و ۱۳۹ اصح المطابع بمبئی۔

رزین مبأن اولیة القلم بالنسبة الی ما عدا النور المحمدی والماء والعرش[1]

سب میں تطبیق یہ ہوگی کہ قلم کی اولیت نور محمدی اور پانی اور عرش کے ماسوا کی بہ نسبت ہے۔

اس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ مصنف عبدالرزاق کی حدیث جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کس قدر مقبول و معتبر ہے۔ اسی لئے حافظ الحدیث علامہ ابن حجر سے بھی علامہ علی قاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ یہ فیصلہ نقل کرتے ہیں۔

اختلفت الروایات فی اول المخلوقات وحاصلها کما بینتها فی شرح شمائل الترمذی ان اولها النور الذی خلق منه علیه علیه الصلوٰة والسلام ثم الماء ثم العرش[2]

اول مخلوقات کے بارے میں روایات مختلف ہیں سب کا حاصل جیسا کہ میں نے شمائل ترمذی کی شرح میں بیان کیا ہے یہ ہے کہ سب سے اول مخلوق وہ نور ہے جس سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پیدا ہوئے پھر پانی پھر عرش۔

لطیفہ: مؤلف سیرۃ النبی نے حدیث نوری کے معارض ذکر کی بھی تو حدیث قلم جس کی اولیت تمام جمہور کے خلاف حتیٰ کہ شاہ ولی اللہ دہلوی جو شاید طبقۂ مؤلف کے نزدیک سب سے زیادہ معتبر و مستند ہیں وہ بھی حدیث مسلم ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:۔

اقول:۔ خلق الله تعالی العرش والماء اول ما خلق ثم خلق جمیع ما اراد ان یوجد فی قوة من قوی العرش یشبه الخیال من قوانا۔

میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ نے عرش اور پانی کو پہلے پیدا فرمایا پھر ہماری قوتوں میں سے قوت خیال کے مشابہ عرش کی ایک قوت میں باقی ان تمام چیزوں کو پیدا فرمایا جنہیں پیدا کرنا چاہا۔

[1] زرقانی ج ۱ ص ۴۸ طبع اول مطبع ازہر مصر ۱۳۲۵ھ

[2] مرقاۃ ج ۱ ص ۱۲۲۔ اصح المطابع بمبئی۔

لیکن لطف کی بات اس کے آگے ہے اول ما خلق اللہ القلم شاہ صاحب کے پیش نظر تھی اس کا جواب دیتے ہوئے وہ فرماتے ہیں۔

ولا تظنن ذالك مخالفا	میں نے جو بیان کیا اسے حدیث کے
للسنة فانه لم يصح عند اهل	خلاف نہ سمجھو کیونکہ لوح و قلم کی صورت کا
المعرفة بالحديث من بيان صورة	بیان جیسا کہ عوام اسے بولتے ہیں علمائے حدیث
القلم واللوح على ما يلهج به	کے نزدیک اس کے بارے میں کوئی قابل
العامة شئ يعتد به والذى	اعتبار چیز ثابت نہیں لوگ جو روایت کرتے
يروونه هو من الاسرائيليات	ہیں وہ اسرائیلیات میں سے ہے حدیث
وليس من الاحاديث المحمدية[1]	محمدی نہیں۔

ہمیں اس سے بحث نہیں کہ شاہ صاحب ثبوت لوح و قلم کی جس طرح تردید فرما رہے ہیں وہ صحیح بھی ہے یا نہیں۔ کہنا یہ ہے کہ کم از کم مؤلف کو اپنے مستند کا فیصلہ تو ذہن میں رکھنا چاہئے تھا وہ اسی حجۃ اللہ البالغہ کی عبارت تمام محدثین کی اکثر و بیشتر کتب متداولہ کو رد کرنے کے لئے چند صفحے پہلے اسی سیرۃ النبی میں نقل کر آئے ہیں۔ غالباً انہوں نے دیدہ و دانستہ جلدی سے یہ حدیث پیش کر کے چھٹی لینے کی کوشش کی ہے کہ ارے سب سے پہلی مخلوق تو قلم ہے اور یہ صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ نور محمدی کی اولیت جس حدیث سے ثابت ہے پتہ نہیں وہ کیسی ہے جب حدیث صحیح کے معارض ہے تو بناوٹی ہوگی، موضوع ہوگی۔ قطعاً یہ ظاہر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ یہ حدیث اتنی معتبر و مستند ہے کہ تمام صحیح احادیث کو سامنے رکھتے ہوئے بھی علما نے اس حدیث کے پیش نظر یہی فیصلہ کیا ہے کہ نور محمدی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پوری کائنات میں سب سے اول مخلوق ہے کیونکہ دیگر احادیث سے جن چیزوں کی اولیت کا پتہ چلتا ہے سب کے متعلق اس حدیث مفصل میں صراحت آ گئی ہے کہ یہ سب اسی نور گرامی صلی اللہ علیہ وسلم سے پیدا کی گئی ہیں لہٰذا ان کی اولیت

[1] شاہ ولی اللہ دہلوی احمد بن عبدالرحیم حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۳۹۸/۳۹۹۔ با ترجمہ، شائع کردہ مکتبہ رحیمیہ دیوبند

اگر ہے تو نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ دیگر مخلوقات کے لحاظ سے ہے۔

(۲)

فرماتے ہیں:۔

روایتوں میں ہے کہ یہ نور پہلے ہزاروں برس سجدہ میں پڑا رہا پھر حضرت آدم کے تیرہ و تار جسم کا چراغ بنا، پھر آدم نے مرتے وقت شیث کو اپنا وصی بنا کر یہ نور ان کے سپرد کیا اسی طرح یہ درجہ بدرجہ ایک سے دوسرے پیغمبر کو سپرد ہوتا ہوا حضرت عبداللہ کو سپرد ہوا اور حضرت عبداللہ سے حضرت آمنہ کو منتقل ہوا۔[1]

"روایتوں میں ہے" کس روایت میں کس کتاب میں کون سے الفاظ کے ساتھ ہے اس کے بیان کی کوئی ضرورت نہیں البتہ یہ جبروتی فیصلہ ضروری ہے:۔

"نور کا سجدہ میں پڑا رہنا اور اس کا موجود ہونا بالکل موضوع ہے۔ اور نور کا ایک دوسرے وصی کو درجہ بدرجہ منتقل ہوتا رہنا بے سروپا ہے"۔[2]

جب ایک روایت میں نہیں کئی روایتوں میں ہے تو پھر موضوع کیسے ہے؟ بے سروپا کیوں ہے؟ دلیل کیا ہے؟ اس کے بیان کی یہاں کوئی ضرورت نہیں۔ بس ہمارا فرما دینا کافی سمجھو۔ کسی آیت قرآنی کے مخالف ہے؟ کسی روایت متواترہ کے معارض ہے؟ کیا دلیل عقلی اس کی تردید کرتی ہے؟ یہ سب کچھ نہ پوچھو۔ سند میں کوئی کذاب، وضاع ہے؟ کسی معتبر محدث نے اس کی تصریح کی ہے؟ کسی حافظ حدیث و عالم رجال نے اس کی توثیق فرمائی ہے؟ ان سب بحثوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں بس ہمارا میلانِ تحقیق یہ ہے کہ موضوع ہے بے سروپا ہے۔

(۱) "یہ نور سجدہ میں پڑا رہا"۔ ہرگز یہ کسی روایت کی عربی عبارت کا

[1] سلیمان ندوی سیرۃ النبی ج ۳ ص ۳۸۷ طبع چہارم۔

[2] ایضاً ج ۳ ص ۳۸۶۔

صحیح و محتاط ترجمہ نہیں ہو سکتا اگر ہے تو کوئی صاحب پیش کریں۔

(۲) "پھر آدم نے مرتے وقت شیث کو اپنا وصی بنا کر یہ نور ان کے سپرد کیا" یقیناً یہ کسی روایت کا ترجمہ نہیں مؤلف نے خود گڑھا ہے اور یہ ان ہی کے وضع کئے ہوئے الفاظ ہیں۔

(الف) حضرت آدم نے مرتے وقت اور ہر بزرگ نے مرتے وقت وصیت کی اس کی صراحت کسی کتاب سے پیش کرنی چاہئے۔

(ب) مرتے وقت پہلے وصی بنایا پھر نور سپرد کیا۔ یہ بھی کوئی محدث صاحب دکھانے کی زحمت کریں۔

(۳) بات دراصل یہ ہے کہ موضوع کہنے کی گنجائش نہ ملی تو خود الفاظ روایت کو توڑ مروڑ کر اردو میں منتقل کیا کہ عقل کے خلاف معلوم ہو اور دلیل عقلی دکھانے کی گنجائش مل جائے کہ صاحب! یہ نور کوئی ایسی چیز تو تھی نہیں کہ الگ سے رکھی ہو اور مرتے وقت بیٹے کے حوالہ کر دی جائے، یقیناً یہ نور پیشانی میں چمکتا ہو گا، پشت میں موجود رہا ہو گا پھر یک بیک مرتے وقت کسی زندہ اور جواں عمر شخص کے حوالہ کرنے کے کیا معنی؟

(۴) حقیقت یہ ہے کہ نور گرامی تخلیق آدم علیہ السلام کے وقت واقعۃً ان کے جسم مبارک میں ودیعت فرمایا گیا اور پشت سے بطن میں، بطن سے پشت میں منتقل ہوتا ہوا آیا۔ آیت کریمہ وتقلبك فی الساجدین کا ایک معنی یہ بھی ہے اور اسی کو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح احادیث میں فرمایا ہے کہ بعثت من خیر القرون قرنا فقرنا۔

جس کے پیش نظر علامہ جلال الدین سیوطی وغیرہ اجلہ علمائے اسلام نے فرمایا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے باپ دادا، دادیاں سبھی ہمیشہ پاک، طیب و طاہر اور موحد و مسلمان تھے۔

(۵) جس فرزند کی پیشانی میں وہ نور گرامی چمکتا ہوا نظر آتا باپ کو معلوم ہو جاتا کہ

نور حق اسی کو عطا ہوا۔ اسے وصیت کی جاتی کہ اس نور کا احترام و تحفظ رکھنا یہ پاک بطن ہی میں ودیعت ہونا چاہئے۔

(۶) ہم خود مؤلف ہی کی عبارت سے اور دوسری دلیلوں سے یہ ثابت کر آئے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے نور کا موجود ہونا بالکل حق و صحیح ہے ورنہ تمام انبیا میں سرکار کے اول مخلوق ہونے کا کیا معنی ہے؟

(۷) جب یہ ثابت ہو چکا کہ وہ نور تخلیق آدم علیہ السلام سے پہلے موجود تھا اور یقیناً وہی نور گرامی لباس بشری میں اس عالم رنگ و بو میں جلوہ گر ہوا جسے قرآن نے فرمایا۔ قد جاءکم من اللہ نور و کتاب مبین ۵

اور محدثین و مفسرین نے تصریح فرمائی کہ اس نور سے مراد ذات سرور کائنات علیہ التحیات ہے تو یقیناً وہی نور گرامی حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد کے واسطے سے درجہ بدرجہ منتقل ہوتا ہوا بطن آمنہ سے فرش گیتی پر رونق افروز ہوا۔

اب رہی صرف یہ بات کہ اس نور کے متعلق حضرت آدم اور ان کی اولاد میں یہ وصیت جاری رہی کہ کسی پاک عورت ہی کو یہ نور حلال و پاک طریقہ سے سپرد ہو، تو اس میں کوئی استبعاد کی بات نہیں۔ البتہ یہ سوال ہو سکتا ہے کہ یہ معلوم کیوں کر ہوتا کہ فلاں فرزند ہی کی پیشانی میں یہ نور جلوہ گر ہے؟ تو محدثین اس کا بھی جواب دے چکے ظاہر ہے کہ یہ نور تھا پیکر خاکی کو جب ملتا تو پیشانی میں چمکتا۔ پہچان لیا جاتا کہ نور کا امین یہی ہے وصیت اسی کو ہوتی۔

(۸) الغرض عقلاً نقلاً اس روایت کو موضوع اور بے سر و پا گردانے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ جب روایت موجود ہے اور دلیل عقلی و نقلی سے اس کی نفی ثابت نہیں تو اسے تسلیم کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ آخر دین کا کون سا رکن منہدم ہوا جا رہا ہے کہ اسے موضوع کہنا ہی لازم و فرض ہے؟

(۹) مؤلف کا یہ بیان ان کے اپنے بے جا تصرف کے ساتھ دو روایتوں کا حاصل ہے۔ ایک روایت علامہ ابن مرزوق نے بطریق امام زین العابدین حضرت

علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمائی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کنتُ نورا بین یدیٰ ربی قبل خلق آدم باربعۃ عشر الف عام۔ میں آدم کی تخلیق سے چودہ ہزار برس پہلے اپنے رب کے حضور نور تھا۔

علامہ زرقانی اس کی توثیق کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ رب کے حضور ہونے کا یہی معنیٰ ہے کہ اس سے انتہائی قرب معنوی میں تھا۔ وہ نور گرامی تمام چیزوں سے پہلے پیدا ہوا پھر قدرت الٰہیہ سے جہاں مشیت ہوئی دورہ کرتا رہا۔ (جیسا کہ حدیث جابر میں صراحت ہے) تو رب کے حضور ہونے کی کیفیت بھی انہیں مراتب دورۂ گرامی سے ایک مرتبہ ہے۔

مزید برآں امام مسلم صاحب صحیح کے شیخ امام محمد بن عمر عدنی کی مسند حدیث سے اس کی مؤید ایک دوسری روایت بھی نقل فرماتے ہیں۔ اور ابو الحسن علی بن قطان سے نقل کرتے ہوئے اس کی تائید و تطبیق بھی بیان کرتے ہیں[1]

دوسری روایت تاریخ خمیس وغیرہ کے حوالوں سے مواہب و شرح مواہب میں نقل ہوئی ہے جس کے مختصر الفاظ یہ ہیں۔ علامہ زرقانی فرماتے ہیں، تاریخ خمیس اور دوسری کتابوں میں ہے۔

وذلك النور كان ينتقل من جبهة إلى جبهة وكان يوخذ في كل مرتبة عهد و ميثاق أنه لا يوضع إلا في المطهرات فأول من أخذ آدم من شيث وهو من ابنه وهكذا۔	وہ نور ایک پیشانی سے دوسری پیشانی کو منتقل ہوتا اور ہر درجہ میں عہد و پیمان لیا جاتا کہ یہ نور پاک عورتوں ہی میں رکھا جائے۔ سب سے پہلے یہ عہد حضرت آدم نے شیث سے لیا۔ انہوں نے اپنے فرزند سے اور پھر اسی طرح ہوتا رہا۔

مواہب کے الفاظ ذرا مفصل ہیں۔ اور جا بجا شرح مواہب میں اس کا تکملہ بھی ہے۔ حاصل وہی ہے جو خمیس سے علامہ زرقانی نے نقل کیا[2]

[1] زرقانی ج ۱ ص ۴۹ [2] زرقانی ج ۱ ص ۶۵۔

(۱۰) الغرض علامہ زرقانی نے بھی اس کی تردید و تغلیط کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اور روایت کو صحیح قرار دیتے ہوئے اس پر مکمل گفتگو کی۔ صاحب مواہب لدنیہ علامہ احمد قسطلانی سے تو استاذ و شاگرد (شبلی و سلیمان) دونوں صاحبان خار کھائے ہوئے ہیں۔ لیکن زرقانی کو تو مستند مانتے ہیں۔ چنانچہ جلد اول میں استاذ نے جہاں مواہب لدنیہ کی بے اعتباری دکھاتے ہوئے دعویٰ کیا ہے کہ اس میں ہزاروں موضوع اور غلط روایتیں بھی ہیں۔ وہیں اس کے نیچے زرقانی علی المواہب کے متعلق رقم طراز ہیں۔

> "حقیقت یہ ہے کہ سہیلی کے بعد کوئی کتاب اس جامعیت اور تحقیق سے نہیں لکھی گئی"[1]

اس سے بھی واضح سنئے۔ سلیمان ندوی اسی جلد سوم میں یہی معجزات کی روایات پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

> "بعد کو جو احتیاط پسند محدثین آئے مثلاً زرقانی وغیرہ وہ ان روایات کے نقل کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تردید اور تضعیف بھی کرتے گئے"[2]

کہنا یہی ہے کہ جب علامہ زرقانی تک نے بھی نہ ان روایات کی تردید فرمائی نہ تضعیف، بلکہ توثیق کی تو پھر آپ نے بالکل موضوع اور بے سروپا کیسے سمجھ لیا؟۔

ع کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

وتقلبك في الساجدين ۵

سے علما کے استدلال پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "اول تو پوری آیت کے الفاظ اور سیاق و سباق اس مطلب کا ساتھ نہیں دیتے، اور دوسرے یہ روایت اعتبار کے قابل نہیں"[3]

[1] شبلی نعمانی سیرۃ النبی ج ۱ ص ۳۷ طبع چہارم معارف اعظم گڑھ [2] سلیمان ندوی سیرۃ النبی ج ۳ ص ۱۲۱ طبع چہارم معارف اعظم گڑھ [3] سلیمان ندوی سیرۃ النبی ج ۳ ص ۷۳۹۔

کیوں اعتبار کے قابل نہیں؟ کیا طبقات ابن سعد، معجم طبرانی اور مسند بزار وغیرہ سب کتابوں میں اس روایت کی جتنی سندیں ہیں سب کی سب باطل و موضوع ہیں؟ یا یہ دلیل عقلی و نقلی کے مخالف ہے؟ کوئی وجہ بتانے کی ضرورت نہیں بس کہہ دینا کافی ہے۔

یہ استدلال امام فخرالدین رازی نے تفسیر کبیر میں یہ ثابت کرنے کے لئے فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آباء و اجداد سب کے سب مسلمان تھے۔ اس پر اسی طرح کا اعتراض پیش کیا گیا جیسا کہ مؤلف نے کہا کہ "پوری آیت کے الفاظ اور سیاق و سباق اس مطلب کا ساتھ نہیں دیتے" اس اعتراض کے متعلق علامہ زرقانی لکھتے ہیں کہ تارِ عنکبوت سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

(۱۱) حقیقت امر یہ ہے کہ قرآن مقدس علوم و معارف کا خزینہ ہے۔ اور علما صراحت فرماتے ہیں کہ قرآن کی ایک آیت بلکہ ایک لفظ میں بھی متعدد معانی ہوتے ہیں۔ اور قرآن اپنے تمام معانی کے ساتھ حجت ہے۔ ہاں کوئی ایسا معنی مراد نہیں لیا جا سکتا جو صریح آیات اور نصوص محکمات کے مخالف و معارض ہو۔ اور ہر معنیٰ اگر بجائے خود صحیح ہے تو وہ حجت اور قابلِ استدلال ہے۔ اس طرح کے استدلال کی متعدد مثالیں خود مؤلف کے مستند علما کی کتابوں سے پیش کی جا سکتی ہیں۔[1]

امام فخرالدین رازی نے اسرار التنزیل میں فرمایا کہ آزر حضرت ابراہیم کا باپ نہ تھا، بلکہ چچا تھا۔ اس پر کئی طرح سے استدلال کیا گیا ہے۔ ایک یہ ہے کہ انبیا کے آباء کافر نہ تھے۔ پھر اس کے دلائل تفصیلاً و اجمالاً لکھ کر کے آیت کریمہ الذی یراك حین تقوم وتقلبك فی الساجدین ذکر کرتے ہوئے اس کا معنیٰ بتاتے ہیں کہ۔

إنه كان ينتقل نوره من	حضور کا نور ایک ساجد سے دوسرے
ساجد إلى ساجد فالآية	ساجد کو منتقل ہوتا رہا۔ یہ آیت اس پر دلیل
دالة على أن جميع آباء محمد	ہے کہ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تمام
كانوا مسلمين۔	آباء مسلمان تھے۔

پھر علامہ زرقانی اس کی تائید حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی حدیث سے پیش کرتے ہیں جسے ابن سعد، بزار، طبرانی، اور ابو نعیم نے روایت کیا ہے۔ اور مزید فوائد نقل فرماتے ہیں۔[1]

حاصل کلام یہ کہ مؤلف سیرۃ النبی نے یہاں پر بالکل موضوع اور بے سروپا ہونے کا جو جبروتی حکم لگایا ہے وہ خود بالکل موضوع، بے سروپا اور ناقابلِ اعتناء ہے حد یہ ہے کہ علما کی تمام تصریحات اور کسی حدیث کو موضوع کہنے سے متعلق ان کی سخت تنبیہات سب کچھ ان کے سامنے ہے جس طرح کسی انسانی من گھڑت کو حدیث ٹھہرانا بہت بڑا جرم ہے اسی طرح کسی حدیث کو انسانی من گھڑت کہنا بھی بہت بڑا گناہ ہے۔ ایک تو حدیث کو حدیث نہ ماننا۔ دوسرے کسی مسلمان بلکہ مسلمانوں کے ائمہ و محدثین کی طرف وضعِ حدیث جیسے بدترین گناہ کبیرہ کی نسبت کرنا، جبکہ کسی معمولی مسلمان کی طرف بھی بلا تحقیق کسی گناہ کی نسبت کرنا خود گناہ ہے۔ لیکن جو حدیث مؤلف کے خلافِ مطلب ہو یا فضائلِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق رکھتی ہو اسے موضوع کہتے ہوئے مؤلف کو نہ تو خدا کا خوف ہوتا ہے نہ مخلوق سے شرم۔ نہ اہلِ علم و تحقیق کے آگے رسوائی کا اندیشہ۔ والعیاذ باللہ تعالیٰ۔

(۳)

بحیرا[2] راہب کا واقعہ جس کی صحت و صداقت مسلم ہے حتیٰ کہ ابن تیمیہ کے

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے الامن والعلیٰ لناعتی المصطفےٰ بدافع البلا باب ۲ فصل اول آیت ۳۲ اور الزلال الانقی من بحر سبقۃ الاتقی از امام احمد رضا قادری بریلوی قدس سرہ۔

[1] حیرت و تعجب کی بات یہ ہے کہ نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی اولیت کو مولوی اشرف علی تھانوی نے بھی نشر الطیب میں تسلیم کیا اور دوسرے بہت سے علماء دیوبند اور مولوی رشید احمد گنگوہی، مولوی حسین احمد مدنی وغیرہ نے بھی حضور کی نورانیت کا ذکر کیا ہے تفصیل کیلئے دیکھئے مقیاس النور مؤلفہ مولانا محمد عمر اچھروی شائع کردہ وحدانیہ لمیٹڈ لاہور۔

[2] بفتح الموحدۃ وکسر الحاء المهملة وسكون المثناة التحتية آخره راء مقصورة قاله غير واحد۔ (وقال البعض آخره راء محدودة۔ ای بحیراء) زرقانی علی المواہب ج ۱ ص ۱۹۴۔

سب سے قریبی شاگرد ابن قیم زاد المعاد میں اسے صحیح مانتے ہیں[1]۔ اور شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ میں اُسے اعتماد کے ساتھ ذکر کرتے ہیں[2]۔ حافظ الحدیث علامہ ابن حجر اس کے تمام رجال کو ثقہ رجال صحیح بخاری سے قرار دیتے ہیں[3]۔ مگر سیرۃ النبی کے مؤلفوں کو اس سے بالکل انکار ہے انہوں نے اس پر بڑی شد و مد سے اعتراضات کئے ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں اس راہب سے حضور کی ملاقات سرے سے تسلیم ہی نہیں۔ اگر مُلاقات تسلیم ہوتی اور تفصیلات میں شبہہ ہوتا تو اسی طرح ذکر کرتے مگر اُن حضرات نے اس واقعہ کو جھٹلانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اور ایسی ایسی نادر تحقیقات کے شگوفے چھوڑے ہیں کہ اگر سب تسلیم کر لئے جائیں تو بخاری و مسلم کی بھی خیر نہیں اس پر شبلی نعمانی نے سیرۃ النبی جلد اول میں کئی جرحیں لکھی ہیں۔ پھر ان کے شاگرد نے جلد سوم میں وہ تمام جرحیں مزید ایجادات کے ساتھ جمع کر دی ہیں۔ جلد اول میں ہے :-

"بحیرا کا مشہور واقعہ اسی سفر (سفر شام میں) پیش آیا۔ اس واقعہ کی تفصیل اس طرح بیان کی گئی ہے کہ جب ابو طالب بُصریٰ میں پہنچے تو ایک عیسائی راہب کی خانقاہ میں اُترے جس کا نام بحیرا تھا۔ اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر کہا: "یہ سید المرسلین ہیں" لوگوں نے پوچھا تم نے کیوں کر جانا؟ اس نے کہا جب تم لوگ پہاڑ سے اُترے تو جس قدر درخت اور پتھر تھے سب سجدے کے لئے جھک گئے۔

یہ روایت مختلف پیرایوں میں بیان کی گئی ہے۔ تعجب یہ ہے کہ اس روایت سے جس قدر عام مسلمانوں کو شغف ہے اس سے زیادہ

---

[1] ابن قیم زاد المعاد فی ہدی خیر العباد ج ۱ ص ۱۷ البتہ اس واقعہ میں حضرت بلال کی موجودگی کا انہوں نے بھی انکار کیا ہے اور لکھا ہے کہ مسند بزار میں حضرت بلال کی شرکت کا ذکر نہیں۔

[2] شاہ ولی اللہ احمد بن عبد الرحیم دہلوی۔ حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۵۶۶ مکتبہ رحیمیہ دیوبند۔

[3] علامہ ابن حجر عسقلانی۔ الاصابۃ فی معرفۃ الصحابۃ ج ۱ ص ۱۷۷ عکس طبع ۱۳۲۸ھ مصر

عیسائیوں کو ہے، سر ولیم میور، ڈریپر، مارگیولوس وغیرہ سب اس واقعہ کو عیسائیت کی فتح عظیم خیال کرتے ہیں[1] اور اس بات کے مُدعی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذہب کے حقائق و اسرار اس راہب سے سیکھے، اور جو نکتے اس نے بتلائے تھے انہیں پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عقائد اسلام کی بنیاد رکھی۔ اسلام کے تمام عمدہ اصول ان ہی نکتوں کے شروح و حواشی ہیں[2]۔ (آگے لکھتے ہیں) لیکن حقیقت یہ ہے کہ روایت ناقابل اعتبار ہے[3]۔

یہ واقعہ چاہے آپ کو تسلیم نہ ہو لیکن جب مسلمانوں کے معتمد علما نے اسے صحیح مانا ہے تو اسلام کی سچی وکالت تو یہ تھی کہ عیسائی مصنفین کے اس خیال باطل کے پرخچے اڑا دئے جاتے اور انہیں دکھایا جاتا کہ تمام تر مذہب عیسائیت بلکہ جملہ کتب آسمانی جو ہمارے سامنے ہیں ان بے شمار تعلیمات سے یکسر خالی ہیں۔ جو سیدنا محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیں۔ عیسائیت کے پاس جب اتنی زبردست تعلیم موجود تھی تو آج تک سامنے کیوں نہ آئی۔ جب خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات و ہدایات میں یہ تفصیلات موجود نہیں تو کیونکر خیال ہو سکتا ہے کہ اُن کے متبع ایک راہب کے پاس وہ سب کچھ موجود تھا جو مذہب اسلام میں آیا۔ پھر کیا ضرورت تھی کہ وہ راہب ہمارے رسول کو سید المرسلین، سید العلمین، رحمۃ للعالمین تسلیم کرے غرض اجمالاً و تفصیلاً عیسائیوں کے اس خیال باطل کا شاندار اور دندان شکن جواب ہو

---

[1] لہٰذا عیسائیوں کا آسان جواب یہ ہے کہ کہدیا جائے یہ روایت ہی باطل ناقابل اعتبار ہے اور پھر ایسے ایسے عجائب و غرائب کی نمائش کرائی جائے اور اپنے مسلم الثبوت رواۃ پر ایسی جرحیں لکھی جائیں کہ پھر وہی عیسائی اُن جرحوں کو لیکر بخاری و مسلم بلکہ صحاح ستہ و جملہ کتب متداولہ کی سینکڑوں ہزاروں حدیثوں کو ناقابل اعتبار اور مردود قرار دیں والعیاذ باللہ تعالیٰ ۱۲ منہ

[2] دربساط نکتہ داناں خود فروشی شرط نیست۔ یا سخن دانستہ گو اے مرد غافل یا خموش۔

[3] شبلی نعمانی۔ سیرۃ النبی ج ۱ ص ۱۷۸ - ۱۷۹ طبع چہارم، معارف اعظم گڑھ۔

ہوسکتا تھا مگر مؤلف نے ہلکے پھلکے لفظوں میں اسے رد کرتے ہوئے سارا زورِ قلم اس پر صرف کیا ہے کہ یہ روایت ہی ناقابلِ اعتبار ہے۔

جلد سوم میں اُن کے شاگرد کا خاص روئے سخن مسلمانوں کی طرف ہے یہ اپنے زعم میں ان لوگوں کی اِصلاح فرما رہے ہیں جو محافلِ میلاد میں بے سرو پا روایات سُننے سُنانے کے خوگر ہیں۔ ظاہر ہے کہ بحیرا سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مُلاقات مان لینے میں اِسلام کا کوئی رُکن منہدم نہیں ہوتا بلکہ اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ بحیرا نے حضور کو سید المرسلین اور سید العٰلمین کہا۔ ان کے آگے شجر و حجر کے جھکنے کی شہادت دی، بادل کے سایہ فگن ہونے کا اقرار کیا، مہرِ نبوت دیکھ کر ان کا خاتم المرسلین ہونا پہچانا ظاہر ہے کہ ان باتوں میں عقائدِ اسلامی کی کوئی مخالفت نہیں بلکہ موافقت ہی موافقت ہے البتہ اسے رد کرنے کے لئے رواۃ پر جرحِ نامعتبر کا جو بدترین فریضہ انجام دیا گیا ہے اس سے اسلام اور مسلمانوں کا سراسر نقصان ہی نقصان ہے۔ کیونکہ وہ رواۃ صرف ترمذی کے نہیں بخاری و مسلم بلکہ صحاحِ ستہ کے بھی ہیں۔ اور ان پر جرحوں کے جو الفاظ نقل کئے گئے یہ الفاظ صرف اُن ہی رواۃ تک محدود نہیں، بخاری و مُسلم بلکہ صحاحِ ستہ بلکہ تمام کتب حدیث کے سینکڑوں رواۃ پر ایسی بے ضرر جرحیں ملتی ہیں کہ فلاں راوی کو ایک جگہ یا چند جگہ وہم ہوا۔ بعض روایتوں میں انہوں نے اپنے رفقائے درس کی مخالفت بھی کی ہے ان سے بعض جگہ غلطیاں بھی ہوگئی ہیں۔ ایسی جرحیں بے شمار راویوں کے بارے میں ملیں گی۔ صحاحِ ستہ کے رجال دیکھئے اور اسماء الرجال کی کتابیں اُٹھائیے۔ کتنے ہیں جو حافظہ و ذہانت اور نقل و روایت میں بالکل معصوم نظر آتے ہیں کہ ناقدین نے ان کی کسی خطا کا کوئی تذکرہ بھی نہ کیا ہو۔

لیکن جب ان جرحوں کے باعث واقعۂ بحیرا کے رواۃ مجروح ٹھہرے، اور ان رواۃ کے باعث یہ واقعہ بے اعتبار ٹھہرا تو جتنے رواۃ پر ایسی جرحیں ہوں گی سب مجروح و بے اعتبار ہوں گے اور ان کی ساری روایتیں بھی بے اعتبار ہوں گی۔

اب اگر وہی عیسائی ایسی ہی جرحوں کو لے کر بخاری و مسلم بلکہ تمام کتب حدیث

کی ہزاروں روایتوں کو غلط، موضوع، اور پایۂ اعتبار سے ساقط گردانیں تو اس میں ان کا کیا قصور ہوگا؟ خود آپ ہی نے انہیں یہ غلط راہ دکھائی اور اسلام پر اعتراضات کے نئے نئے دروازے کھولے۔ اور کوئی بھی مسلمان آپ کو مستند مان لینے کے بعد پھر اسلام کی وکالت کیا کر سکے گا۔ اور ان نئے اعتراضات کے جوابات کیا دے سکے گا؟ یقیناً یہ کوئی دانشمندانہ طریقہ نہیں کہ عیسائیوں سے مرعوبیت کے نتیجے میں ان کا دندان شکن اور صحیح جواب دینے کی بجائے خود اپنی ہی بیخ و بن اکھاڑ پھینکنے کی راہ نکالی جائے۔

اب آیئے ان طلسمات نقد و جرح کا تماشا کیجئے جو استاذ و شاگرد نے اس روایت کے پیچھے دکھائے ہیں۔ اور پھر ان کے نقصانات کا اندازہ کیجئے کہ واقعہ بحیرا کے اعتراض سے تو چھٹی مل سکتی ہے مگر ویسے ہی بلکہ اس سے زبردست ہزاروں اعتراضات سر پر کھڑے ہو کر ھَلْ مِنْ مُبَارِزٍ؟ کا نعرہ لگائیں گے اور اس گروہ کا کوئی جواب دینے والا نظر نہ آئے گا۔ فرماتے ہیں:-

> یہ روایت اختصار اور تفصیل کے ساتھ سیرت کی اکثر کتابوں میں اور بعض حدیثوں میں بھی مذکور ہے[1] مگر ابن اسحٰق اور ابن سعد وغیرہ کتب سیر میں اس کے متعلق جس قدر روایتیں ہیں ان سب کے سلسلے کمزور اور ٹوٹے ہوئے ہیں[2] اس قصہ کا سب سے محفوظ[3] طریقۂ سند وہ ہے جس میں عبدالرحمٰن بن غزوان جو ابو نوح قراد کے نام سے مشہور تھے، یونس بن اسحٰق سے، اور وہ ابوبکر بن ابی موسیٰ سے، اور وہ

---

[1] پھر بھی اصرار یہی ہے کہ غلط ہے [2] مرسل و منقطع ہونے کے باعث اگر یہ مردود ہے تو کتب سیر کا ۳/۴ حصہ مردود ہو جائے گا۔ [3] محفوظ کہاں رہ گیا؟ آپ نے تو اس کی اس بری طرح خبر لی ہے کہ اس کے سامنے غیر محفوظ بھی کہے گا کہ میں تجھ سے اچھا ہوں۔ [4] اس صیغے پر حیرت کیجئے آگے اس سے زیادہ ہے۔ یہ اگرچہ امام احمد بن حنبل کے استاذ ہیں مگر جس پر جرح کرنی ہے اس کا احترام کیا معنی؟

اپنے باپ ابو موسیٰ اشعری سے اس کی روایت کرتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس سلسلۂ سند میں نہ صرف عبدالرحمٰن بن غزوان بلکہ دوسرے رواۃ بھی جرح کے قابل ہیں۔

(۱) سب سے اول یہ کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری مسلمان ہو کر ۷ھ میں یمن سے مدینہ آئے تھے، اور یہ واقعہ اس سے پچاس برس پہلے کا ہے حضرت ابو موسیٰ نہ تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے اور نہ کسی اور شریک واقعہ کی زبان سے اپنا سنا بیان کرتے ہیں اس لئے یہ روایت مرسل ہے۔

یہ کہئے کہ انہوں نے کسی سے سنا ہی نہیں، خود اگر گڑھ کر نہیں بیان کیا تو ضرور ان کے بیٹے نے گڑھ کر ان کی طرف منسوب کیا۔ صرف مرسل ہی کہا تو کون سا بڑا تیر مار لیا۔ مرسل کو تو تمام علمائے حنفیہ و مالکیہ اور جمہور علما باب احکام میں بھی حجت مانتے ہیں اور فضائل میں تو اگر صاحب ارسال غیر ثقہ ہو تو بھی بالاتفاق معتبر ہے۔

(۱) راوی خود ثقہ ہونے کے باوجود اگر شریک واقعہ ہو یا شریک واقعہ سے صراحۃً روایت کرتا ہو جب تو روایت معتبر ہے ورنہ نہیں" یہ کلیہ کسی اسلامی کتاب میں کہیں نہیں مل سکتا۔ استاذ و شاگرد نے اسے انگریزوں سے سیکھا ہے انگریز بھی ہر جگہ اتنی شدت کے قائل نہیں مگر ان حضرات نے اپنی طرف سے بھی کچھ شدت بڑھالی ہے۔

(۲) صحابی کی روایت بھی مرسل اور نامعتبر ہوتی ہے اس سے بالکل پہلی مرتبہ کان آشنا ہوئے ہیں۔ باب احکام میں بھی صحابی نے اگر کوئی ایسا مسئلہ بیان کیا جس میں قیاس و اجتہاد کو دخل نہیں تو تمام علما یہی فرماتے ہیں کہ وہ مرفوع کے حکم میں ہے یقیناً صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سن کر بیان کیا ہے۔

(۳) الصحابۃ کلہم عدول۔ تمام صحابہ عادل ہیں۔ اس کلیہ سے عام مسلمان بھی آشنا ہیں۔ لہٰذا کبھی کسی عالم و محدث کو صحابی کی روایت کو اس لئے

رد کرنے کی جسارت نہیں ہوئی کہ وہ خود شریک واقعہ نہیں نہ کسی شریک واقعہ سے اپنا سننا بیان کیا۔ یہ عجوبہ صرف یہیں دیکھنے میں آیا۔

(۴) علامہ سخاوی فرماتے ہیں" حضرت ابو موسیٰ[1] اشعری نے یا تو خود نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سنا جب تو کیا کہنا؟ انتہائے سند ہے۔ یا بعض کبارِ صحابہ سے معلوم کیا۔ یا یہ واقعہ عہد رسالت و عہد صحابہ میں مشہور و معروف تھا۔ حضرت ابو موسیٰ نے بطور استفاضہ اسے لیا[2]۔ علامہ سخاوی یہ سب اسی لئے بیان کر رہے ہیں کہ صحابی کی روایت کے غلط ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں جب صحیح ہونا متعین ہے تو کسی سے سننے اور اخذ کرنے کی مذکورہ صورتوں میں سے کوئی صورت بھی متعین ہے۔ اور ہر صورت مستند و معتبر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صحابی اور حضرت ابو موسیٰ اشعری جیسے فقیہ و مجتہد صحابی کی روایت پر مؤلف کی یہ جرح بالکل ہی لغو اور ناقابل التفات ہے۔

(۵) اگر اس جرح کو درست مان لیا جائے تو حضرت ابن عباس وغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اصاغر صحابہ کی سینکڑوں روایتیں بلکہ بعض اکابر صحابہ کی بھی کچھ حدیثیں نامعتبر اور ساقط الاعتبار ہو جائیں گی۔ حدیث کا معمولی طالب علم اور تاریخ و سیر کا ادنیٰ شغف رکھنے والا بھی اس جرح کی قباحت و شناعت اور اس کے مضرات کا اندازہ آسانی سے کر سکتا ہے۔

(۲) اس واقعہ کو حضرت ابو موسیٰ سے ان کے صاحبزادے ابو بکر روایت کرتے ہیں مگر ان کی نسبت کلام ہے کہ انہوں نے اپنے باپ سے کوئی روایت سنی بھی ہے یا نہیں، چنانچہ ناقدین فن کو اس باب میں بہت کچھ شک ہے۔ امام احمد بن حنبل نے تو اس سے قطعی انکار

---

[1] ابو موسیٰ کنیت ہے جس سے وہ معروف و مشہور ہیں نام عبداللہ بن قیس ہے رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

[2] زرقانی علی المواہب ج ۱ ص ۱۹۴ طبع اول مطبع ازہری مصر ۱۳۲۵ھ

کیا ہے۔ بنا بریں یہ روایت منقطع ہے اس کے سوا ابن سعد نے لکھا ہے کہ وہ ضعیف سمجھے جاتے ہیں۔

(۶) وہ کتنے رُواۃ ہیں جنہیں ساری دُنیا نے ثقہ کہا ہو، اور جن پر اعتراض کرنے والا کوئی نہ پیدا ہوا ہو؟ دیکھنا یہ چاہیئے کہ کسی راوی کے بارے میں قول راجح کیا ہے؟ اسی لئے شمس الدین ذہبی جیسے عظیم ناقد فن کا یہ قول ہے۔

لم یجتمع اثنان من علماء هذا الشان علی توثیق ضعیف ولا علی تضعیف ثقة۔

علماء نقد رجال میں سے دو عالم بھی کسی ضعیف کی توثیق اور کسی ثقہ کی تضعیف پر متفق نہیں۔

(۷) ابوبکر بن ابی موسیٰ کی ثقاہت کا مسلم ہونا اس سے ظاہر ہے کہ یہ رجال صحاح ستہ سے ہیں۔ علامہ ذہبی نے تذہیب التہذیب میں بصراحت ذکر کیا ہے روی عن ابیہ[1] اپنے والد سے انہوں نے روایت کی، جس سے معلوم ہوا کہ ان کا سماع ہی راجح و معتبر ہے عدم سماع والے قول کا اعتبار نہیں۔

(۸) اپنے والد سے ان کی یہی ایک روایت نہیں صحاح ستہ اٹھا کر دیکھئے کہ انہوں نے کتنی روایتیں اپنے والد سے کی ہیں۔ ان روایات کو شافعی المسلک ائمہ بخاری و مسلم وغیرہ کے باب احکام میں استناد کرتے ہوئے نقل کر رہے ہیں۔ حضرات شافعیہ کے نزدیک حدیث مرسل "احکام میں" حجت نہیں اگر ابوبکر کا سماع ان کے والد سے ثابت نہ ہوتا تو ائمہ شافعیہ ان روایات سے استناد نہ کرتے۔

(۹) صحیح مسلم و ابوداؤد و نسائی و ابن ابان و طحاوی میں یہ سند ہے:۔ بندر بن عثمان نا ابوبکر بن ابی موسیٰ عن ابیہ ان سائلا سأل النبی صلی اللہ علیہ وسلم فلم یرد علیہ شیئا حتی امر بلالا فاقام الفجر حین انشق الفجر الخ۔

[1] تہذیب التہذیب، علامہ ابن حجر عسقلانی ص ۱۴۱ ج ۱۲۔

میں نے ایک سند کا پتہ دے دیا، مزید تلاش کر سکتے ہیں۔ یہ کہنے کا موقع نہیں کہ یہاں عن ابیہ کا لفظ ہے، اس لئے کہ روایت عنعنہ میں ارسال کی گنجائش ہے یہ جب کہہ سکتے تھے کہ ابوبکر مُدلّس ہوتے مگر یہ مدلّس نہیں۔

(۱۰) اندازہ کیجئے کہ ان کو نا معتبر قرار دینے سے صحاح ستہ کی کتنی روایات ساقط الاعتبار ہو جائیں گی۔ افسوس کہ مؤلف کو یہ بھی خیال نہ ہوا کہ ابوبکر رجال صحاح ستہ سے ہیں۔

(۳) ابوبکر سے یونس بن اسحٰق اس واقعہ کو نقل کرتے ہیں گو متعدد محدثین نے ان کی توثیق کی ہے تاہم عام فیصلہ یہ ہے کہ وہ ضعیف ہیں" یحیٰی کہتے ہیں" کہ ان میں سخت بے پروائی تھی۔ شعبہ نے ان پر تدلیس کا الزام قائم کیا۔

امام احمد ان کی اپنے باپ سے روایت کو ضعیف اور ان کی عام روایتوں کو مضطرب اور ایسی ویسی کہتے ہیں۔ ابوحاتم کی رائے یہ ہے کہ وہ راست گو ہیں۔ لیکن ان کی اپنے باپ سے حدیث حجت نہیں۔ ساجی کا قول ہے کہ وہ سچے ہیں اور بعض محدثین نے انکو ضعیف کیا ہے، ابوحاکم کا بیان ہے کہ اکثر ان کو اپنی روایتوں میں وہم ہو جاتا تھا۔

(۱۱) یہ ہے تحقیق نو کا کرشمہ۔ ان عجائب و غرائب کی کہاں تک تردید کی جائے "تاہم عام فیصلہ یہ ہے کہ وہ ضعیف ہیں"؟ بالکل اخباری زبان و بیان ہے "ان میں سخت بے پروائی تھی"۔ کیا تھی کچھ پتہ نہیں۔ "شعبہ نے ان پر تدلیس کا الزام قائم کیا"۔ جناب مطلقاً تدلیس ایسا کوئی امر نہیں جس سے راوی کی ثقاہت پامال ہو جائے۔ یہ دیکھئے کہ صحیحین میں کتنے مدلّس ہیں مثلاً قتادہ، سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، عبدالرزاق، ولید بن مسلم، سلیمان اعمش۔ تو کیا صحیحین میں ان جلیل القدر ائمہ کی جتنی روایتیں ہیں سب ساقط الاعتبار قرار دی جائیں؟ ردّو

قبول کا آخر کوئی معیار بھی مقرر ہے یا نہیں؟ اگر یونس اپنے باپ سے روایت میں تدلیس کرتے ہیں تو اس کا تقاضا یہ کہاں ہے کہ ابوبکر سے بھی ان کی روایت کو پایۂ اعتبار سے ساقط گردانا جائے۔ روایتوں میں وہم ہو جانا بھی ایسا عیب نہیں جس کی بنا پر راوی غیر معتبر ہو جائے دیکھئے کہ رجال صحیحین میں کتنے حضرات ہیں جن کے وہم کی صراحت ہے مگر وہ بالاتفاق ثقہ و معتبر ہیں۔ چند حضرات کے نام سنئے۔ (۱) ابراہیم بن یوسف بن اسحٰق (۲) اسامہ بن زید اللیثی (۳) اسمٰعیل بن عبدالرحمٰن اسدی (۴) ایمن بن نابل (۵) جابر بن عمرو (۶) جہر بن نوف (۷) حاتم بن اسمٰعیل (۸) حرب بن ابی العالیہ (۹) حرمی بن عمامہ (۱۰) حزم بن ابی حزم (۱۱) عطاء بن ابی مسلم۔ صدوق یہم کثیرا (۱۲) احمد بن بشیر (۱۳) حسن بن خلف (۱۴) ہشام بن سعد۔ صدوق لہ اوہام ورمی بالتشیع (۱۵) احمد بن ابی الطیب وغیرہ صدوق لہ اغلاط (دیکھئے میزان و تہذیب) [1]

(۱۲) حق یہ ہے کہ یونس بن ابی اسحٰق ثقہ ہیں۔ ابن معین نے ان کو ثقہ کہا۔ امام بخاری نے جزء القراءۃ خلف الامام میں ان سے استناد کیا۔ امام مسلم نے صحیح میں ان سے روایت کی۔ اور یوں ہی وہ سنن اربعہ کے رجال سے بھی ہیں۔ [2]

(۴) چوتھا راوی عبدالرحمٰن بن غزوان ہے جس کا نام مستدرک اور ابونعیم میں ابونوح قراد ہے اس کو اگرچہ بہت سے لوگوں نے ثقہ کہا ہے تاہم وہ متعدد منکر روایتوں کا راوی ہے مالیک والی جھوٹی حدیث اسی نے روایت کی ہے، ابو احمد حاکم کا بیان ہے کہ اس نے امام لیث سے ایک منکر روایت نقل کی ہے۔ ابن حبان نے لکھا ہے کہ وہ غلطیاں کرتا تھا اور امام لیث اور مالک سے مالیک والی حدیث

[1] فتاویٰ رضویہ ج ۲ ص ۲۲۲ و ۲۲۶۔ مطبوعہ دہلی۔

[2] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۴۳۴۔

نقل کرنے کی وجہ سے اس کی طرف سے دل میں خلجان ہے۔

(۵) حافظ ذہبی میزان میں لکھتے ہیں کہ عبدالرحمٰن بن غزوان کی منکر روایتوں میں سب سے زیادہ منکر بحیہ اراہب کا قصہ ہے اس قصے کے غلط ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ اس میں یہ ہے کہ ابوبکر نے بلال کو آپ کے ساتھ کر دیا حالانکہ حضرت ابوبکر اس وقت بچے تھے اور حضرت بلال پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔

(۱۳) خود مؤلف کو یہ تسلیم ہے کہ ان کو بہت سے لوگوں نے ثقہ کہا ہے مگر نشۂ تنقید میں سب کچھ نقل کرتے جا رہے ہیں اور یہ خبر نہیں کہ انجام کیا ہوگا۔ جناب عالی نے یونس کے متعلق یہ فرمایا کہ گو متعدد محدثین نے ان کو ثقہ کہا ہے تاہم عام فیصلہ یہ ہے کہ وہ ضعیف ہیں اس لحاظ سے یہاں لکھنا چاہئے تھا کہ "کچھ لوگوں نے ان پر جرح کی ہے تاہم عام محدثین کا فیصلہ یہی ہے کہ وہ ثقہ ہیں"۔ کیونکہ امام احمد بن حنبل نے ان سے روایت کی وہ جسے ثقہ نہیں جانتے اس سے روایت نہیں کرتے ابن معین نے ان کے بارے میں کہا۔ صالح لیس بہ باس۔ صالح ہیں ان میں کوئی عیب نہیں ابوحاتم نے کہا صالح ہیں۔ ابن مدینی، ابن کثیر، یعقوب بن شیبہ نے کہا ثقہ ہیں۔ ابن سعد نے کہا ثقہ ہیں۔ ابن حبان نے انہیں ثقات میں ذکر کیا [1] تقریب التہذیب میں ان کے متعلق یہی فیصلہ لکھا کہ ثقۃ لہ افراد [2] (مات ۱۸۷ھ)

(۱۴) حد یہ ہے کہ مؤلف نے یہ بھی دیکھنے کی زحمت نہ فرمائی کہ صرف ابوداؤد ترمذی، نسائی ہی کے رجال سے نہیں بلکہ رجال صحیح بخاری سے بھی ہیں۔

(۱۵) علامہ ذہبی نے جو کہا کہ اس روایت کی بعض باتیں غلط ہیں تو وہ غلطی یہی ہے کہ حضرت بلال کی شرکت کا اس میں ذکر ہے اگرچہ حضرت بلال اس واقعہ میں شریک نہیں مگر علامہ ذہبی کا یہ فرمانا کہ وہ اس وقت پیدا بھی نہ ہوئے تھے محل نظر ہے۔

[1] تہذیب التہذیب ص ۲۴۹ ج ۶ [2] تقریب التہذیب ص ۲۰۸

علما نے ان کا یہ قول رد کر دیا ہے۔ ابن حبان نے ثقات میں بیان کیا ہے کہ حضرت بلال صدیق اکبر کے ہم عمر تھے [1]

(۱۶) باوجود اس غلطی کے صرف علامہ ابن حجر اور امام سخاوی وغیرہ علما ہی نے نہیں بلکہ ابن قیم اور شاہ ولی اللہ نے بھی اس کی صحت کو تسلیم کیا ہے۔ ابن قیم نے بھی یہ کہا ہے کہ حضرت بلال کی شرکت صحیح نہیں، مسند بزار میں شرکت بلال کا ذکر نہیں صرف یہ ہے کہ ایک شخص کو بھیجا گیا۔ واقعہ البتہ صحیح ہے صرف ذہبی اگر اس کو معتبر نہیں مانتے تو جملہ محدثین کے مقابلہ میں تنہا ان کا لحاظ نہیں کیا جا سکتا۔

(۱۷) عبدالرحمٰن بن غزوان پر سب سے زبردست بہتان یہ ہے کہ ممالیک والی جھوٹی حدیث روایت کی۔ جلد اول میں ہے ممالیک کی ایک روایت ہے جس کو محدثین جھوٹ اور موضوع خیال کرتے ہیں [2]

اس بہتان کی پردہ دری ضروری ہے ممالیک والی حدیث اعلیٰ درجہ کی صحیح حدیث ہے عبدالرحمٰن بن غزوان سے اس کی سند میں غلطی ہوئی کہ انہوں نے مالک عن الزہری کہا یوں ہی لیث کی سند میں بھی ان سے غلطی ہوئی۔ دار قطنی فرماتے ہیں۔

والصواب عن اللیث ما حدثناہ بحر بن نصر من کتابہ۔ ثنا ابن وھب اخبرنی اللیث عن زیاد بن عجلان عن زیاد مولی بن عیاش قال:۔

أتی رجل فجلس بین	ایک شخص آکر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ
یدی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ	علیہ وسلم کے سامنے بیٹھ گیا پھر عرض کیا
علیہ وسلم فقال یا رسول اللہ ان	یا رسول اللہ میرے کچھ غلام ہیں جو مجھ سے
لی مملوکین یکذبوننی و یخونوننی	جھوٹ بولتے ہیں۔ میری خیانت کرتے ہیں

[1] زرقانی ج ۱ ص ۱۹۶

[2] شبلی نعمانی سیرۃ النبی ج ۱ ص ۱۸۱ طبع چہارم اعظم گڑھ۔

ویعصوننی واضربھم فکیف انا منھم؟ فقال لہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یحسب ما خانوک وعصوک وکذبوک وعقابک ایاھم۔ (الحدیث)	میری بات نہیں مانتے ہیں اور میں انہیں مارتا، گالی دیتا ہوں تو ان کے ساتھ میرا یہ عمل کیسا ہے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ان کی خیانت، نافرمانی دروغ گوئی اور تمہارے ان کو سزا دینے کا حساب کیا جائے گا۔ الحدیث۔

ظاہر ہے کہ یہ حدیث عقل و نقل کے ذرا بھی خلاف نہیں نہ ہی اس کی سند بے اعتبار ہے پھر بھلا کوئی محدث اسے موضوع اور جھوٹی کیسے کہہ سکتا ہے؟ معلوم نہیں کہاں سے ان حضرات نے سمجھ لیا کہ محدثین اس حدیث کو غلط اور جھوٹی سمجھتے ہیں۔ یا پھر دیدہ و دانستہ عبدالرحمٰن بن غزوان پر بہتان تراشتے ہیں اور یہ خیال نہیں کرتے کہ کسی بے گناہ پر ناکردہ گناہ کے بہتان کا عذاب کیا ہے؟ — نہ ہی یہ سوچتے کہ اتنی سخت جرح اپنی طرف سے ان کی طرف منسوب کر دی جائے گی تو عیسائی اور مسلمان یہ سمجھنے پر مجبور ہوں گے کہ امام بخاری نے جھوٹی حدیث روایت کرنے والوں کی حدیثیں اپنی صحیح میں درج کی ہیں۔ لہٰذا صحیح بخاری کا بھی کوئی خاص اعتبار نہیں۔

(۶) جلد اول میں ہے:۔ حافظ ابن حجر کا یہ ادعا بھی صحیح نہیں کہ اس روایت کے تمام رواۃ قابل سند ہیں۔ عبدالرحمٰن بن غزوان کی نسبت خود ان ہی حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ وہ خطا کرتا تھا۔ اس کی طرف سے اس وجہ سے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نے ممالیک کی روایت نقل کی ہے۔
شبلی نعمانی۔ سیرۃ النبی ج ۱ ص ۱۸۱)

ان کی خطا کی حقیقت کیا ہے وہ بیان ہو چکی بہرحال وہ خطا ہی ہے کوئی بالقصد جرم نہیں معاذ اللہ وضع حدیث سے تو اسے دور کا بھی تعلق نہیں

اب آپ کو کیسے سمجھایا جائے کہ اس طرح کی خطا سے کوئی راوی غیر ثقہ نہیں ہو جاتا آپ نے تہذیب التہذیب میں "خطا کرتا تھا" صرف ان ہی کے متعلق کیوں دیکھا؟ رجال بخاری و مسلم میں کتنے ہیں جن کے متعلق میزان و تہذیب ہی نہیں بلکہ تقریب التہذیب میں بھی یہی ملے گا[1] مگر اس کے باوجود وہ ثقہ اور مسلم الثبوت ہیں اگر صحیحین کو بھی رد کرنے کا شوق ہے تو سنئے چند نام:- (۱) اسمٰعیل بن مجالد (۲) اشہل بن حاتم (۳) بشر بن عبیس (۴) حارث بن عبید (۵) حبیب بن ابی حبیب (۶) حجاج بن ابی زینب (۷) حسان بن ابراہیم (۸) حسان بن حسان بصری (۹) حسان بن عبداللہ کندی (۱۰) حسن بن بشیر بن مسلم (۱۱) حسن بن ذکوان ورمی بالقدر (۱۲) خالد بن خداش (۱۳) خالد بن عبدالرحمٰن السلمی (۱۴) شریک بن عبداللہ بن ابی عمر (۱۵) عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن دینار (۱۶) عبدالمجید بن عبدالعزیز (۱۷) مسکین بن بکیر (۱۸) معتمل بن عبداللہ — سب کے متعلق ہے کہ "خطا کرتے" صدوق یخطی (۱۹) حجاج بن ارطاۃ۔ کثیر الخطاء والتدلیس (۲۰) شریک بن عبداللہ نخعی۔ صدوق یخطی کثیر التغیر حفظہ (۲۱) صالح بن رستم المزنی صدوق کثیر الخطاء — (۲۲) عبداللہ بن صالح۔ صدوق کثیر الغلط ثبت فی کتابہ و کانت فیہ غفلۃ (۲۳) فلیح بن سلیمان۔ صدوق کثیر الخطاء — (۲۴) مطر الوراق صدوق کثیر الخطاء وحدیثہ عن عطاء ضعیف (۲۵) نعیم بن حماد۔ صدوق یخطی کثیر[2]

ان تمام حضرات کے متعلق ذکر خطا کے ساتھ صرف صدوق کہا گیا۔ صدوق کا درجہ ثقہ سے فروتر ہے۔ ثقہ اعلیٰ کلمۂ توثیق ہے۔ علامہ ابن حجر نے عبدالرحمٰن بن غزوان کے متعلق اسی تقریب التہذیب میں فرمایا۔ ثقۃ لہ افراد۔ مقصد یہ ہے کہ اگرچہ یہ بھی رجال بخاری سے ہیں مگر ان میں سے کتنوں سے اعلیٰ تر ہیں مگر نشۂ تنقید کا کیا علاج؟

---

[1] میزان و تہذیب وغیرہ مبسوط کتابوں میں تفصیلاً ہر طرح کے اقوال نقل ہوتے ہیں مگر تقریب التہذیب میں علامہ ابن حجر عسقلانی شافعی وہ ذکر کرتے ہیں جو ان کے نزدیک قول فیصل ہوتا ہے۔

[2] تقریب التہذیب فتاویٰ رضویہ ج ۲ ص ۲۲۱-۲۲۲ ملخصاً مطبوعہ دہلی۔

(۱۸) حقیقت امر یہ ہے کہ وہم و خطا جب تک فاحش نہ ہوں، جب رد نہیں وہ بھی باب احکام میں۔ امام احمد رضا فاضل بریلوی قدس سرہ فرماتے ہیں:-

"چند اوہام یا کچھ خطائیں محدث سے صادر ہونا نہ اسے ضعیف کر دیتا ہے نہ اس کی حدیث کو مردود۔ ورنہ وہ کتنے ہیں جو بالکل پاک صاف گزر گئے۔ یہ ہیں تمام محدثین کے امام الائمہ سفیان بن عیینہ جنہوں نے زہری سے روایت میں بیس سے زیادہ حدیثوں میں خطا کی۔ امام احمد رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:- مجھ میں اور علی بن مدینی میں مذاکرہ ہوا کہ زہری سے روایت میں ثابت تر کون ہے؟ علی نے کہا سفیان بن عیینہ۔ میں نے کہا:- امام مالک کہ ان کی خطا سفیان کی خطاؤں سے کم ہے۔ قریب بیس حدیثوں کے ہیں جن میں سفیان نے خطا کی پھر میں نے اٹھارہ گنا دیں۔ اور ان سے کہا آپ مالک کی خطائیں بتائیں۔ وہ دو تین حدیثیں لائے پھر جو میں نے خیال کیا تو سفیان نے بیس سے زائد حدیثوں میں خطا کی ہے۔ ذکرہٗ فی المیزان۔ بایں ہمہ امام سفیان کے ثقہ، ثبت، حجت ہونے پر علمائے امت کا اجماع ہے"[1]

> (۷) امام بیہقی اس کی صحت کو صرف اس قدر تسلیم کرتے ہیں کہ "یہ قصہ اہل سیر میں مشہور ہے" حافظ سیوطی نے خصائص میں امام موصوف کے اس فقرہ سے یہ سمجھا ہے کہ وہ بھی اس کے ضعف کے قائل ہیں اس لئے اصل روایت میں ابن سعد وغیرہ سے چند اور سلسلے نقل کئے ہیں مگر ان میں سے کوئی بھی محفوظ نہیں۔
> (سلیمان ندوی، سیرۃ النبی سوم۔ طبع چہارم ص ۷۶۲-۷۶۴)

(۱۹) اسی کو کہتے ہیں توجیہ کلام القائل بما لا یرضی بہ القائل (کسی کے کلام کا ایسا مطلب بتانا جو قائل کی مرضی کے برخلاف ہو) امام سیوطی نے امام بیہقی کے مشہور فرمانے کا ہرگز یہ مطلب نہ سمجھا کہ وہ اس کے ضعف کے قائل ہیں امام بیہقی نے دلائل میں بطریق صحیح اس واقعہ کی تخریج فرمائی ہے پھر اس کے مشہور

---

[1] امام احمد رضا قادری:- فتاویٰ رضویہ دوم ص ۲۲۵ مطبوعہ دہلی۔

ہونے کا بھی حکم فرمایا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ درجۂ صحت سے بڑھ کر مرتبۂ شہرت تک پہنچ چکا ہے کسی واقعہ کا اہل سیر میں مشہور ہونا صحت محض پر بہت فوقیت رکھتا ہے۔ دیکھئے کہ ۱۲ ربیع الاول کو سرکار کی ولادت ہونے کو تمام ارباب سیر محض شہرت کی بنا پر جملہ روایات وحسابات پر مقدم ذکر کرتے ہیں اور اسی پر اعتماد کرتے ہیں۔ امام احمد رضا قادری بریلوی علیہ الرحمہ نے جو راضی میں بھی بجتائے زمانہ تھے از روئے حساب ایک تاریخ کی تعیین کرنے کے باوجود روایت مشہور پر اعتماد کیا ہے کیونکہ ہمارا حساب تو صحیح ایام و شہور کے لحاظ سے ہوگا اور ارباب جاہلیت مہینوں کی تقدیم و تاخیر کر لیا کرتے تھے جبھی تو حجۃ الوداع میں سرکار نے ارشاد فرمایا آج تاریخ و یوم گھوم پھر کر اپنی اصلی حالت پر آگیا۔ لہٰذا واقع اور شمار میں وقت ولادت جو تاریخ و یوم تھا ضروری نہیں کہ حساب اس کی موافقت کر جائے پھر قمری تاریخوں سے حساب کی مطابقت بے حد مشکل و بعید ہے۔ غرض حکم شہرت سے حکم ضعف سمجھ لینا کج فہمی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ ہو سکتا ہے آج کل کے ارباب تحقیق اس طرح کی اصطلاح ایجاد کر بیٹھے ہوں۔ مگر جب کوئی مؤرخ و محدث بلا تنقید کسی واقعہ کو مشہور بتاتا ہے تو وہ اسے اعلیٰ درجہ کا معتبر شمار کرتا ہے۔

(۲۰) امام جلال الدین سیوطی نے وہیں ذہبی کا قول نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں میں اس کے بعض واقعات باطل سمجھتا ہوں پھر اس کا رد علامہ ابن حجر سے نقل کرتے ہیں کہ روایت اعلیٰ درجۂ صحت پر ہے لہٰذا اس کے رد کی کوئی وجہ نہیں سوائے اس کے کہ "حضرت بلال کو حضرت ابوبکر نے بھیجا" یہ کسی راوی کا وہم ہے پھر علامہ سیوطی اس کی صحت و شہرت کے ثبوت میں متعدد سندیں نقل کرتے ہیں۔ رہا یہ کہ ان میں کوئی بھی محفوظ نہیں، تو اس کا کیا شکوہ۔ جب وہ رواۃ بخاری جن کی صحت و مقبولیت پر اجماع ہے محفوظ نہیں اور رواۃ بخاری سے مروی حدیث محفوظ نہ رہی اور سب کو بے باکانہ اپنی جرح نامعتبر کا نشانہ بنا دیا گیا تو دیگر رواۃ و اسانید

کا کیا شمار؟

ہم نے قصہ بحیرا سے متعلق سند پر بیس وجوہ سے کلام کیا اور یہ ثابت کر دیا کہ مؤلفان سیرۃ النبی کی تنقیدیں صریح خیانتوں پر مشتمل ہیں جنہیں تسلیم کر لینے کے بعد بخاری و مسلم کسی کی خیر نہیں ہزاروں احادیث باطل و بے کار ہو جائیں گی اور ہزاروں ثقہ رواۃ پایۂ اعتبار سے ساقط ٹھہریں گے۔ والعیاذ باللہ تعالیٰ۔

مؤلف نے اپنی کتاب میں کل تیس روایتوں پر جرح کی ہے جن میں سے اکثر کو ضعیف کہا ہے۔ اور ضعیف باب فضائل میں بالاتفاق معتبر ہے۔ پھر بھی ان روایات کی تنقید میں انہوں نے جو خیانتیں کی ہیں اور بعض مسلم الثبوت رُواۃ پر جو بلا وجہ کی جرحیں لکھ ماری ہیں وہ ان کی تحقیق نو کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ بعض روایات کو موضوع کہنے کی بھی جسارت کی ہے۔ لیکن یہ محض تہور و بے باکی ہے۔ موضوع ہونے کی کوئی وجہ ذکر نہیں کرتے بلکہ یوں ہی موضوع و بے سر و پا لکھ ڈالتے ہیں جو چنداں قابل التفات نہیں۔ طرفہ یہ کہ بعض صحیح و حسن روایات کو بھی ضعیف و نامعتبر قرار دے دیا ہے۔ [illegible] ایک مثال تو یہی واقعہ بحیرا ہے جس پر تنقید کا انجام آپ دیکھ چکے۔ ایک اور ملاحظہ کر لیجئے۔

(۴)

> وہ معجزے جن میں گدھے، اونٹ، بکری، ہرن، گوہ، بھیڑیئے، شیر وغیرہ جانوروں کے انسانوں کی طرح بولنے یا کلمہ پڑھنے کا ذکر ہے، بروایت صحیحہ ثابت نہیں۔

حاشیہ میں فرماتے ہیں:۔

> یعنی ضعیف روایتوں میں گویہ آیا ہے، لیکن ان کو صحیح کا درجہ حاصل نہیں، ان روایتوں میں سے ایک بھیڑیئے کے بولنے کا قصہ زیادہ مشہور ہے، جو دلائل بیہقی، مسند احمد، حاکم اور ترمذی میں بطرق متعددہ مذکور ہے، جن میں سب سے قوی حضرت ابوسعید خدری

کی روایت ہے۔ حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے اور ذہبی نے بشرط مسلم کہا ہے (مستدرک ج۴ ص۴۶۶) لیکن امام بخاری نے کہا ہے کہ اس کی سند قوی نہیں (زرقانی علی المواہب ج۵ ص۱۹۳) [1]

مؤلف کو یہ تسلیم ہے کہ بھیڑیئے کے بولنے کا واقعہ ذہبی تک تے صحیح اور بشرط مسلم مانا ہے۔ اب اس کے رد کرنے کی وجہ کوئی نہ تھی لیکن یہ شگوفہ چھوڑ دیا کہ "لیکن امام بخاری نے کہا ہے کہ اس کی سند قوی نہیں"۔ گویا جب تک کہ کسی روایت فضائل کی صحت پر سارا جہان متفق نہ ہو جائے یہ اس کی صحت تسلیم نہیں کر سکتے۔

اب سنئے کہ اس روایت کا درجہ کیا ہے۔ اور امام بخاری کا کلام کس سند پر ہے۔ علامہ زرقانی نے یہ واقعہ حضرت ابوہریرہ، حضرت انس، حضرت ابن عمر، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے ذکر ہونے اور اس کی توثیق کرنے کے بعد یہ بحث چھیڑی ہے کہ بھیڑیئے سے کلام کرنے والے شخص کا نام کیا تھا اس سلسلے میں انہوں نے چند نام نقل کئے ہیں۔ (۱) اُھبان بن اوس (۲) سلمہ بن الاکوع (۳) اھبان بن الاکوع حضرت سلمہ اسلمی کے چچا (۴) اھبان بن الاکوع بن عباد خزاعی (۵) رافع بن رہیعہ (۶) اھبان بن صیفی (۷) رافع بن عمیرہ طائی۔

پھر فرماتے ہیں اگر واقعہ متعدد ہے تو کوئی اختلاف نہیں۔ علامہ ابن عبدالبر وغیرہ نے فرمایا: "تین صحابہ نے بھیڑیئے سے کلام کیا (۱) رافع بن عمیرہ (۲) سلمہ بن الاکوع (۳) اہبان بن اوس" (اس سے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جب تین صحابہ کے کلام ذئب کی علماء نے تصریح کی ہے تو تعدد واقعہ قرینِ حقیقت ہوگا) پھر ایک نام "اُھبان بن اوس" کی تعیین اور ان کے بھی کلام کرنے پر امام بخاری کی تاریخ اور ابونعیم کے دلائل سے نقل کرتے ہیں۔

---

[1] سلیمان ندوی: سیرۃ النبی ج۳ ص۷۷۴ طبع چہارم معارف پریس اعظم گڑھ۔

عن اھبان بن اوس قال کنت فی غنم لی فشدّ الذئب علی شاۃ منھا فصِحت علیہ فاقعی الذئب علیٰ ذنبہ یخاطبنی. الخ

اہبان بن اوس سے مروی ہے انہوں نے فرمایا میں اپنی کچھ بکریوں میں تھا کہ بھیڑیئے نے ایک بکری پر حملہ کیا میں چلایا تو بھیڑیا اپنی دم پر بیٹھ کر مجھ سے (بولا) خطاب کرنے لگا۔ الخ

پھر یہ ہے کہ اھبان بن اوس بارگاہ رسالت میں حاضر ہو کر مسلمان ہوئے۔

آخر میں علامہ زرقانی فرماتے ہیں۔

قال البخاری اسنادہ لیس بالقوی۔ قال الحافظ لان فیہ عبداللہ بن عامر الاسلمی وھو ضعیف [1]

امام بخاری نے فرمایا اس کی سند قوی نہیں۔ حافظ ابن حجر نے فرمایا اس لئے کہ اس میں عبداللہ بن عامر اسلمی ہیں اور وہ ضعیف ہیں۔

ایک تو یہ کہ لیس بالقوی (قوی نہیں) اور لیس بقوی (ذرا بھی قوی نہیں) دونوں میں فرق ہے۔ دوسرے یہ کہ اسی زرقانی میں اسی جگہ تصریح کر دی گئی کہ امام بخاری نے عبداللہ بن عامر اسلمی کے سبب اس سند کو قوی نہ کہا۔ اب اس تصریح کو مؤلف نے نقل کیا اور یہ ظاہر کیا کہ امام بخاری واقعۂ ذئب ہی کی صحت کے قائل نہیں۔ حالانکہ یہ صرف ایک سند کے بارے میں کلام ہے جس میں اھبان بن اوس رضی اللہ عنہ کی صراحت ہے۔ لہٰذا اگر ثابت بھی ہوا تو یہ کہ اھبان بن اوس کا بھیڑیئے سے گفتگو کرنا امام بخاری کی ذکر کردہ کسی قوی روایت سے ثابت نہیں۔

لیکن اصل واقعہ جس میں اھبان بن اوس کی تصریح نہیں، اور جس میں عبداللہ بن عامر اسلمی راوی ضعیف بھی نہیں وہ کیسے غیر صحیح ہو گیا؟ ادنیٰ درجہ کا طالب علم بھی اس کھلی ہوئی خیانت کو اچھی طرح محسوس کر سکتا ہے کہ مؤلف کی فضائل دشمنی کس درجہ کو پہونچی ہوئی ہے۔

---

[1] زرقانی علی المواہب ج۵ ص۱۴۴۔ طبع اوّل ۱۳۲۶ھ مطبع ازہری مصر۔

مؤلف کے مستند علامہ ابن کثیر نے "البدایہ والنہایہ" ج ۶ (ص ۱۴۳ تا ص ۱۴۶) میں متعدد سندوں اور متعدد صحابیوں سے بھیڑیئے کی گفتگو کو نقل کیا ہے جس میں حضرت ابوسعید خدری کی روایت کو جو مسند احمد سے نقل ہے امام بخاری کی شرط پر صحیح کہا ہے۔ اور بھی کئی سندوں کو بشرط سنن لکھا ہے۔ ان کی منقولہ روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کے کئی واقعے پیش آئے۔

پھر زرقانی کی طرح البدایہ میں بھی بھیڑیئے سے کلام کرنے والے کے متعلق گفتگو کی ہے۔ اور حافظ ابن عدی سے نقل کیا ہے کہ اس چرواہے کی اولاد کو "بنو مکلم الذئب" بھیڑیئے سے کلام کرنے والے کی اولاد کہا جاتا کہ ان کے پاس مال اور مویشی تھے۔ بنی خزاعہ میں سے ہیں اور بھیڑیئے سے کلام کرنے والے کا نام اُصبان ہے۔ محمد بن اشعث خزاعی ان کی اولاد سے ہیں۔ پھر نقل کرتے ہیں۔

قال لبیھقی:۔ فدل علی اشتھار ذلک وھذا مما یقوی الحدیث [1]	امام بیہقی نے فرمایا:۔ پتہ چلا کہ یہ واقعہ مشہور تھا اور اس سے حدیث کی تائید ہوتی ہے۔

پھر وہی امام بخاری کی سند بروایت عبداللہ بن عامر اسلمی ذکر کر کے ان کا ارشاد اسنادہ لیس بالقوی نقل کرتے ہیں۔

بہرحال اصل واقعہ کی صحت میں سارے جہان کے محدثین میں کسی کو کلام نہیں یہ صرف مؤلف کی فضائل دشمنی ہے کہ ایسے صریح و صحیح واقعہ کو بھی بکمال بے باکی غیر صحیح گردانے کی سعیِ ناکام کی ہے۔ پھر آخر میں ان کا یہ اعتذار کیا حیثیت رکھتا ہے؟ فرماتے ہیں۔

> گو ان میں سے بعض روایتوں کو اہل سیر اور مصنفین نے فضائل نبوی میں اپنی کتابوں میں درج کیا ہے مگر اس سے ان کی صحت ثابت

[1] یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ کسی واقعہ کا مشہور ہونا حدیث کو قوت بخشتا ہے اور اس کا مؤید ہوتا ہے نہ کہ الٹے یہ کہا جائے کہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی اس کے ضعف کے قائل ہیں۔ ۱۲ مصباحی غفرلہٗ

> نہیں ہوتی۔ اور اگر ان میں سے کوئی روایت سنداً صحیح ثابت ہو جائے تو اس خاکسار ہیچمداں کو اسکے قبول کرنے میں کوئی عذر نہیں (ص ۷۶، ج ۳)

ہم تو دیکھ رہے ہیں کہ واقعۂ ذئب سنداً صحیح ثابت ہے حتیٰ کہ خود مؤلف امام ذہبی سے اس کا بشرط مسلم ہونا نقل کرتے ہیں اور علامہ زرقانی کا پورا کلام ان کے پیش نظر ہے۔ ان کو یہ بھی معلوم ہے کہ امام بخاری کو صحت واقعہ سے انکار نہیں صرف اصبان بن اوس سے متعلق سند کو وہ "لیس بالقوی" فرما رہے ہیں مگر اس کو انہوں نے اس پر منطبق کر ڈالا کہ اصل واقعہ ہی کی صحت وہ تسلیم نہیں کرتے اور اپنا یہ کلیہ بحال رکھا کہ جانوروں کے کلام کا کوئی بھی واقعہ بروایت صحیحہ ثابت نہیں!

آخر اس سے کس مزاج و ذہن کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ اگر آپ کا مقصد فضائل نبوی پر کلام کرنا نہ ہوتا تو واقعہ کے سنداً صحیح ہو جانے کے بعد تو کم از کم سر تسلیم خم کرتے ضعاف کو آپ باب فضائل میں حجت نہ جانیں لیکن صحاح کو بھی رد کر ڈالنے کے بعد آپ کا یہ فرمانا بالکل بے وزن ہے کہ:۔

> ان روایتوں کی تنقید سے غرض نعوذ باللہ فضائل نبوی میں کلام نہیں ہے بلکہ یہ اعتقاد ہے کہ حضور انور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذات پاک کی طرف جو بات منسوب کی جائے وہ ہر طرح صحیح ہو۔ ص ۷۷، ج ۳۔

اگر یہ مقصد ہوتا تو کم از کم اس واقعہ کو تو صحیح مان لیتے جو یقیناً ہر طرح صحیح ہے۔ اس کی سند بشرط بخاری و مسلم ہے اس کی صحت نہ صرف چند مصنفین و محدثین کو بلکہ سارے جہان کے علما کو تسلیم ہے۔ بایں ہمہ سب سے انکار صریح اس بات کی دلیل قوی ہے کہ مؤلف کی غرض وہ نہیں جو انہوں نے اپنے خوشنما لفظوں میں بیان کی بلکہ ان کا بنیادی مقصد یہی فضائل نبوی میں کلام ہے۔ مزید ثبوت آگے آ رہا ہے تھوڑا انتظار کیجئے۔ چند روایات کی تنقیح اور ملاحظہ کیجئے۔

(۵)

> وہ تمام روایتیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزہ

سے حضرت آمنہ یا کسی اور مردہ کے زندہ ہونے کا بیان ہے — وہ سب جھوٹی اور بنائی ہوئی ہیں ص ۴۷، ج ۳ ۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا سب سے بڑا معجزہ مردوں کو زندہ کرنا ہے، اور صرف ان ہی کے ساتھ مخصوص ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی یہ معجزہ منسوب کیا گیا، ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو اسلام کی دعوت دی، اس نے کہا "جب تک آپ میری لڑکی کو زندہ نہ کر دیں گے میں ایمان نہ لاؤنگا چنانچہ آپ نے اس کی قبر پر جا کر آواز دی اور وہ زندہ نکل کر باہر آئی اور پھر چلی گئی۔ اسی طرح یہ روایت بھی گھڑی گئی ہے کہ آپ کی والدہ بھی آپ کی دعا سے زندہ ہوئیں اور آپ پر ایمان لائیں۔
(سیرۃ النبی ص ۳۲۷، ج ۳)

(۱) احیاء موتی کا معجزہ صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مخصوص ہے یہ بالکل غلط ہے مؤلف نے اپنے دعوے پر کوئی دلیل نہ پیش کی۔ اسی طرح جن احادیث کو باطل و موضوع کہا اس پر کسی دلیل کی حاجت نہ سمجھی صرف دعویٰ کافی سمجھا۔

(۲) کیا مؤلف کو اس سے انکار ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھ پر چار پرندے زندہ ہوتے۔ یہ واقعہ سیرت کی کسی کتاب میں نہیں بلکہ قرآن کریم میں موجود ہے — حضرت ابراہیم کو مردہ زندہ ہوتے دیکھنے کی تمنا ہوئی اور رب سے دعا کی۔ حکم ہوا چار پرندے لے لو انہیں اپنے ساتھ ہلا ملا لو پھر ان کے ٹکڑے کر کے پہاڑوں پر بکھیر دو پھر انہیں پکارو تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آئیں گے انہوں نے ایسا ہی کیا۔ پرندوں کے ٹکڑے پہاڑوں پر منتشر کر دئے اور سر اپنے پاس رکھا پکارا تو سب جڑ کر دوڑتے ہوئے آئے اور سر سے مل کر اڑ گئے اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں گائے کے بعض حصے سے مارنے پر مقتول کے جی اٹھنے کا واقعہ، یوں ہی بچھڑے کی پرستش کرنے والوں کے بعد قتل

زندہ کئے جانے کا واقعہ خود قرآن کریم میں موجود ہے۔

(۳) علاوہ ازیں اولیائے امت سے احیاء موتی کے واقعات کا کوئی شمار نہیں سیدنا غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ جن کی کرامات سے متعلق شیخ عزالدین عبدالعزیز بن عبدالسلام جیسے عظیم فقیہ اور بلند پایہ عالم کا یہ ارشاد ہے کہ ان کی کرامات جتنی معتبر سندوں سے ہم تک پہونچیں کسی ولی کی کرامات اتنی صحیح سندوں سے ہم تک نہیں پہونچیں[1] ان ہی (سیدنا غوث اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ) سے مردے جلانے کے متعدد واقعات ان کے سوانح کی سب سے معتبر و اعلیٰ کتاب بہجۃ الاسرار شریف میں مروی ہیں — بہجۃ الاسرار کے متعلق یہ ذہن میں رکھنا چاہئے کہ اس کی روایات عام تذکرۂ اولیاء کی کتابوں کی طرح نہیں بلکہ محدثانہ نقد و تصحیح اور تسلسل سند کے ساتھ لکھی گئی ہیں اور اس کے مصنف سے متعلق ذہبی جیسے ناقد فن نے "امام یگانہ" جیسے کلمات لکھے ہیں — اور اگر تمام اولیائے کرام کی نسبت دیکھا جائے تو احیائے موتی کی کرامت اتنی متواتر سندوں سے مروی ہے کہ دنیا کا کوئی صاحب عقل و انصاف جو عناد و مکابرہ اور انکار بدیہیات کی لعنت سے پاک ہو جرأت انکار نہیں کر سکتا — صرف رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ایک معجزے کا انکار کرنے کے لئے بغیر کسی معمولی دلیل کے یہ دعویٰ کیا گیا کہ مردے جلانا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مخصوص معجزہ ہے۔ حالانکہ ان کے ساتھ نہ احیاء موتی مخصوص ہے نہ اندھے کو بینا کرنا، نہ برص والے کو شفا دینا ہاں! اس زمانے میں یہ ان کا اتنا اعلیٰ معجزہ تھا جس نے یکتائے روزگار اطبا کو عاجز و لاچار کر دیا اور ساری ترقی یافتہ طب کے پاس اس کا کوئی جواب نہ ملا اعجاز کے لئے اتنا ہی کافی ہے نہ یہ کہ ایک نبی کے پاس جو معجزہ ہو وہ کسی اور نبی کے پاس یا بطور کرامت کسی ولی کے پاس نہ ہو۔

(۴) فرض کر لیا جائے کہ حضور کے دست مبارک پر کوئی مردہ زندہ نہ ہوا

[1] قلائد الجواہر و بہجۃ الاسرار۔

تو بھی اس سے انکار کی گنجائش نہیں کہ حضور کے اولیائے امت کے ہاتھوں پر بیشمار مردے زندہ ہوتے ــــ اور یہ مسلم ہے کہ ولی کی کرامت اس کے نبی کا معجزہ ہوتی ہے۔ لہٰذا محدثین نے اگر یہ فرمایا کہ "کسی بھی نبی کو جو معجزہ ملا حضور کو وہی یا اس کے مثل بلکہ اس سے اعظم و افضل ضرور ملا" ہرگز غلط نہیں ــــ پھر محدثین کے اس متفقہ فیصلہ کی تردید میں ورق در ورق سیاہ کرنا بالکل بے سود ہے ــــ اسی ذیل میں باحیاے موتی کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا خاصہ بتا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا تحقق باطل و موضوع کہنا ایک گھناؤنی کوشش ہے جو کوئی عیسائی تو کر سکتا ہے مگر کسی مسلم کے قلم سے ہرگز نہ ہونی چاہیے۔

(۵) مؤلف کے مستند علامہ ابن کثیر نے اولیا و صحابہ سے احیاے موتی کی روایات صحیح و معتبر سندوں سے نقل کی ہیں اور فرمایا ہے وھی معدودۃ فی المعجزات لأن کل ما یثبت لولی فھو معجزۃ لنبیہ یہ معجزات میں شمار ہیں اس لئے کہ جو کرامت بھی کسی ولی کے لئے ثابت ہو وہ اس کے نبی کا معجزہ ہے[1]

(۶) علاوہ ازیں غزوۂ خندق کے ذکر میں انہوں نے بلا نقد و جرح یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ حضرت جابر نے ضیافت میں جو بکری پیش کی تھی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کی ہڈیاں جمع کر کے دعا کی اور وہ زندہ اٹھ کھڑی ہوگئی۔ کیا یہ روایت بھی موضوع اور بناوٹی ہے؟

(۷) حضرت آمنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے زندہ کئے جانے کی حدیث پر علامہ زرقانی نے مفصل کلام کیا ہے ــــ اس کی تین سندیں ذکر کی ہیں۔ اور آخر میں فیصلہ فرمایا ہے کہ حق یہ ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے لیکن موضوع ہرگز نہیں۔ بلکہ علامہ جلال الدین سیوطی کا قول نقل کیا ہے کہ اگر اس کا انحصار ابو غزیہ پر نہ ہوتا تو میں اسے حسن کہتا[2] ــــ

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۶ [2] زرقانی علی المواہب ج ۱ ص ۱۶۸

علما کی یہ تمام تحقیقات مؤلف کے سامنے ہیں۔ لیکن اعتراف حقیقت پر انکار حقیقت کو صرف اس لئے ترجیح دی ہے کہ اس کا تعلق فضائل رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہے اور ان احادیث سے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عظمت کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

(۶)

ایک روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ مبارک اس قدر روشن تھا کہ اندھیرے میں آپ جاتے تھے تو اُجالا ہو جاتا۔ چنانچہ ایک دفعہ رات کو حضرت عائشہ کے ہاتھ سے سوئی گر گئی ــــ تلاش کی نہیں ملی، دفعۃً آپ تشریف لے آئے تو چہرۂ مبارک کی روشنی میں سوئی چمک اُٹھی اور مل گئی، یہ بالکل جھوٹ ہے۔ (ص ۶۷، ج ۳)

(۱) یہ روایت کہاں اور کس کتاب میں ہے اس کی سند کیسی ہے مصنف نے کچھ پتہ نہ دیا۔ جھوٹ ہے تو کیوں؟ کیا یہ عقل و نقل کے خلاف ہے یا پندرہ دلائلِ وضع میں سے کوئی دلیل اس میں پائی جاتی ہے؟ کوئی تصریح نہیں۔

(۲) مؤلف کے ذکر کردہ ابتدائی الفاظ کسی کتاب میں میری نظر سے نہ گزرے حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے متعلق واقعہ علامہ جلال الدین سیوطی نے خصائص کبریٰ میں بروایت ابن عساکر ذکر کیا ہے۔ الفاظ یہ ہیں۔

عن عائشۃ قالت کنت اخیط فی السحر فسقطت منّی الابرۃ فطلبتھا فلم اقدر علیھا فدخل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتبینت الإبرۃ بشعاع نور وجھہ فاخبرتہ فقال: یا حمیراء الویل ثم الویل ثلاثا لمن حرم النظر الی وجھی[1]

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے فرماتی ہیں میں سحر کے وقت سی رہی تھی کہ مجھ سے سوئی گر گئی تلاش کی تو نہ پائی پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو ان کے چہرۂ مبارک کے نور کی شعاع سے سوئی نمایاں ہوگئی۔ میں نے حضور کو خبر دی تو فرمایا۔ اے حمیراء خرابی ہے خرابی تین بار اس کے لئے جس نے میرے

---

[1] خصائص کبریٰ ج ۱ ص ۶۳ ــــ دائرۃ المعارف حیدر آباد ۱۳۲۰ھ

چہرے کی طرف دیکھنا حرام کیا۔

علامہ جلال الدین سیوطی نے اپنی کتاب خصائص کبریٰ کے مقدمہ میں فرمایا ہے:۔

نزهته عن الاخبار الموضوعة ومايرد، وتتبعت الطرق والشواهد لما ضعف من حيث السند۔

میں نے اس کتاب کو موضوع اور قابل رد حدیثوں سے پاک رکھا ہے۔ اور جو سنداً ضعیف ہیں ان کے طرق و شواہد تلاش کئے ہیں۔

علامہ کی اس تصریح کے پیش نظر خصائص میں ان کی ذکر کردہ حدیث کسی طرح موضوع نہیں قرار دی جاسکتی غایت یہ ہے کہ ضعیف ہو اور ضعیف فضائل میں بالاتفاق مقبول ہے۔

(۳) پھر جمال مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحیح و حسن احادیث کی روشنی میں دیکھئے تو یہ واقعہ ذرا بھی بعید نہیں معلوم ہوتا۔ مؤلف کے مستند علامہ ابن کثیر کی نقل کردہ چند احادیث ملاحظہ ہوں۔

(ا) حضرت ربیعہ بنت معوذ فرماتی ہیں۔

لو رأيته رأيت الشمس طالعة۔

تم انہیں دیکھتے تو سورج طلوع ہوتا دیکھتے۔

(ب) بخاری و مسلم میں حضرت صدیقہ سے بروایت زہری عن عروۃ ثابت ہے۔ فرماتی ہیں:۔

دخل علیّ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مسروراً تبرق اسارير وجهه۔

میرے پاس رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مسرت کی حالت میں تشریف لائے ان کے چہرے کی لکیریں چمک رہی تھیں۔

(ج) بیہقی، ترمذی، نسائی کی حضرت جابر بن سمرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں۔

رأيت رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وسلم فى ليلة

میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو صاف بے ابر رات میں دیکھا، سرخ

إضحيان وعليه حلة حمراء فجعلت انظر اليه والى القمر فلهو عندى أحسن من القمر۔

جوڑا زیب تن تھا۔ میں حضور کو اور چاند کو دیکھنے لگا۔ تو واقعۃً حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میرے نزدیک چاند سے زیادہ خوبصورت تھے۔

(د) صحیح بخاری میں حضرت کعب بن مالک کی حدیث توبہ میں ہے۔

وكان رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وسلم اذا سر استنار وجهه كأنه قطعة قمر۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب مسرور ہوتے تو ان کا چہرۂ مبارک روشن ہوجاتا جیسے وہ چاند کا ٹکڑا ہو۔

شمائل نبوی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے باب میں اس طرح کی بہت سی حدیثیں مل سکتی ہیں اس سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ محدثین کا حسنِ مصطفےٰ علیہ السلام کو حسن یوسف علیہ السلام سے افضل و برتر بتانا حق و صحیح ہے۔ اور مؤلف نے انکار جامعیتِ مصطفےٰ کے تحت اس پر جو کلام کیا ہے صراحۃً باطل و غلط ہے۔ اور ان سب کی بنیاد صرف اس گستاخانہ عقیدے پر ہے کہ وہ بس ہماری ہی طرح تھے۔ اس لئے جیسے ہمارا چہرہ بے نور ہے ویسے ہی ان کا بھی ہوگا۔

(۷)

اس طرح مؤلف نے یہ جو لکھا ہے کہ:۔

عوام میں مشہور ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ نہ تھا لیکن یہ کسی روایت سے ثابت نہیں۔ (ص ۵۷، ج ۳)

اس کی بنیاد بھی اسی پر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "ہمارے جیسے" تھے اور ہمارے سایہ ہے تو ان کے بھی ضرور تھا۔

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نفی سایہ کے مسئلہ کو فرمایا کہ "عوام میں مشہور ہے" یعنی کسی عالم و محدث کا یہ قول نہیں حالانکہ اکابر محدثین و علمائے اسلام نے اپنی کتابوں میں صراحۃً ذکر فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سایہ نہ تھا

چند حضرات کے اسماء گرامی یہ ہیں :۔

① امام عبداللہ بن مبارک۔ جن کی جلالت شان آفتاب نیم روز سے زیادہ روشن وظاہر۔ امام احمد بن حنبل، امام سفیان ثوری۔ امام یحییٰ بن معین۔ ابو بکر بن ابی شیبہ۔ حسن بن عرفہ وغیرہم اکابر ائمہ ومحدثین ان کے شاگرد ہیں۔ ② حافظ بزین محدث ③ علامہ شمس الدین ابن الجوزی صاحب کتاب الوفاء فی احوال المصطفےٰ ④ علامہ ابن سبع صاحب شفاء الصدور ⑤ علامہ قاضی عیاض صاحب کتاب الشفاء فی تعریف حقوق المصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ⑥ علامہ خفاجی صاحب نسیم الریاض شرح شفاء قاضی عیاض ⑦ علامہ جلال الدین سیوطی صاحب خصائص کبریٰ ⑧ علامہ احمد قسطلانی صاحب مواہب لدنیہ ⑨ علامہ محمد بن عبدالباقی زرقانی صاحب شرح مواہب ⑩ شیخ محقق شاہ عبدالحق محدث دہلوی صاحب مدارج النبوۃ۔ (قدست اسرارہم رحمۃ اللہ علیہم۔)

② کسی روایت سے ثابت نہ ماننا بھی غلط ہے۔

حکیم محمد بن علی ترمذی حضرت ذکوان سے راوی ہیں :۔

ان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم لم یکن یری لہ ظل فی شمس ولا قمر۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا سایہ نہ دھوپ میں نظر آتا نہ چاندنی میں۔

سیدنا عبداللہ بن مبارک اور حافظ علامہ ابن جوزی محدث رحمہما اللہ تعالیٰ حضرت سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کرتے ہیں :۔

لم یکن لرسول اللہ صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ظل ماقام مع شمس الا غلب ضوءہ ضوءھا ولا مع السراج الا غلب ضوءہ ضوءہ۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سایہ نہ تھا جب بھی آفتاب کے سامنے کھڑے ہوئے ان کا نورِ عالم افروز خورشید کی روشنی پر غالب آگیا۔ اور نہ قیام فرمایا چراغ کی ضیا میں مگر یہ کہ حضور کی تابش

نور نے اس کی چمک کو دبالیا۔

③ منکرین کہیں بھی صراحۃً یہ ثابت نہ کرسکے کہ یہ سب۔ حدیثیں موضوع یا ضعیف ہیں۔ ضعیف کہنے کے لئے بھی دلیل چاہیئے۔ ایک ایک سند کے بارے میں صحیح نقد کر کے ثابت کرنا ہوگا کہ ضعیف ہے اور حسن ہونے کی کوئی صورت نہیں اور اگر بفرض غلط ثابت ہو بھی گیا کہ ہر سند ضعیف ہے تو ہمارے لئے کچھ مضر نہیں کیونکہ نفیِ ظل فضائل سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے جس کے لئے حدیث ضعیف کافی ہے یہ مسئلہ نہ باب احکام کا ہے نہ اصولِ عقائد کا۔ جس کے لئے اعلیٰ درجہ کا ثبوت درکار ہو۔ پھر بھی اعلیٰ درجہ کا ثبوت موجود ہے جو آگے آرہا ہے :۔

④ بالفرض اگر کسی روایت سے ثابت نہ بھی ہوتا تو عقل کا قطعی فیصلہ یہی تھا کہ حضور کے سایہ نہ ہو کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا "نور" ہونا مسلمانوں کا اجماعی عقیدہ ہے۔ اور ظاہر ہے کہ نور کے سایہ نہیں ہوتا۔

قرآن فرماتا ہے :۔

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۙ (مائدہ ۵/۱۵)

بے تحقیق آیا تمہارے پاس خدائے تعالیٰ کی طرف سے ایک نور (ذات مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) اور کتاب روشن (قرآن کریم)

اور فرماتا ہے :۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۔ (احزاب ۳۳/۴۵، ۴۶)

اے نبی ہم نے تمہیں بھیجا گواہ، اور خوش خبری دینے والا۔ اور ڈر سنانے والا ——— اور خدا کی طرف بلانے والا اور چمکتا چراغ۔

یہاں سراج سے مراد چراغ ہے یا چاند یا سورج۔ سب صورتیں ممکن ہیں اور خود قرآن عظیم نے آفتاب کو سراج فرمایا۔

وجعل القمر فیھن نورا وجعل الشمس سراجا. (نوح ۱۶/۷۱) اور چاند کو ان میں نور بنایا اور سورج کو چراغ بنایا۔

حضرت ربیع بنت معوذ کی حدیث گزر چکی۔

لو رأیتہ لرأیت الشمس طالعۃ۔ انہیں دیکھتے تو سورج کو طلوع ہوتا دیکھتے۔

(۵) حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جلد سوم مکتوب سوم میں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لئے سایہ نہ ہونے پر ایک اور استدلال فرماتے ہیں:

اور صلی اللہ علیہ وسلم سایہ نبود و نیز در عالم شہادت سایۂ ہر شخص از شخص لطیف تر است چوں لطیف تر ے از وے صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم در عالم نباشد اور اسایہ چہ صورت دارد علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰت والتسلیمات[1]

"حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لئے سایہ نہ تھا۔ عالم شہادت میں ہر شخص کا سایہ جسم سے لطیف تر ہوتا ہے۔ جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے زیادہ لطیف عالم میں کوئی نہیں تو ان کا سایہ ہونے کی کیا صورت ہے"۔

(۶) اس سے پہلے ایک استدلال اور ذکر کر چکے ہیں جسے وہیں دیکھنا چاہیئے۔

(۷) آپ نے دیکھا کہ عقل و نقل ہر ایک کا تقاضا یہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سایہ ہر گز نہ ہو۔ علمائے کرام اور محدثین اعلام اپنی کتابوں میں ہمیشہ یہی لکھتے آئے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سایہ نہ تھا۔ مگر یہ منکرین جب انکار پر آتے ہیں تو حدیثوں کو تو بلا دلیل باطل و موضوع لکھ ڈالنا ان کے قلم کا ادنیٰ کرشمہ ہے اور عقل سے تو تعلق ہی نہیں کہ دلیل عقلی کو سمجھ سکیں معلوم نہیں کسی محدث یا عالم

---

[1] دفتر دوم۔ جلد سوم ص ۵۱۵ مکتبۃ الشیخ استنبول ترکی ۱۹۷۶ء عکس مطبع ایجوکیشنل کراچی۔

کے قول سے انہوں نے اخذ کیا ہے کہ حضور کے سایہ تھا۔ کسی آیت میں ہے۔ یا حدیث میں کچھ پتہ نہیں؟۔ بس اس خیال پر سایہ کا اثبات کرتے جا رہے ہیں کہ ہمارے لئے ہے۔ لہٰذا حضور کے لئے بھی تھا۔ کیونکہ وہ بھی ہماری ہی طرح ہیں۔ والعیاذ باللہ تعالیٰ۔ سارے جہان کے علما و محدثین کے ارشادات ایک طرف اور ان حضرات کا خیال باطل ایک طرف۔ خدا عقل سلیم دے اور ہدایت سے نوازے[1]

(۸)

منزل صہبا میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے ڈوبا ہوا سورج لوٹائے جانے کا واقعہ علما سلف و خلف ہمیشہ سامنے آئے۔ ابن تیمیہ نے اس سے انکار کیا۔ اور موضوع کہہ ڈالا۔ حافظ مزی و ذہبی بھی اس کے قائل ہوئے۔ ابن کثیر نے ضعیف کہنے پر اکتفا کیا مؤلف کو وہی چاہیئے جس سے فضیلت سے انکار ہو سکے لہٰذا نقل روایت کے بعد لکھ دیا "یہ روایت بھی صحیح طریقہ سے ثابت نہیں" اور حاشیہ لگا دیا کہ عام ائمہ رجال کا رجحان اس روایت کے موضوع یا کم از کم ضعیف ہونے کی طرف ہے۔ ابن جوزی نے موضوعات میں شمار کیا ہے الخ۔[2]

(۱) یہ واضح ہو چکا ہے کہ اگر کسی محدث نے کسی روایت کو موضوع کہہ دیا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ نفس واقعہ ہی موضوع ہے بلکہ وہ جرح بس اسی سند تک محدود رہے گی۔ دوسری سند سے وہ واقعہ ثابت و صحیح ہو سکتا ہے۔ پھر ابن جوزی

---

[1] نفی سایہ کی پوری بحث امام احمد رضا قادری بریلوی علیہ الرحمہ کے مندرجہ ذیل رسائل میں دیکھیں یہاں ان ہی رسائل کے چند اقتباسات نقل ہوئے ہیں۔

۱:۔ قمر التمام فی نفی الظل عن سید الانام۔

۲:۔ نفی الفئ عمن انار بنورہ کل شئ۔

۳:۔ ھدی الحیران فی نفی الفئ عن سید الاکوان۔

[2] سلیمان ندوی:۔ سیرۃ النبی سوم ص ۷۶، طبع چہارم معارف اعظم گڑھ۔

ابن تیمیہ کے موضوع کہنے کا کیا اعتبار۔ کتنی صحیح اور بے شمار ضعیف حدیثوں کو موضوع کہہ گئے۔

حقیقت امر یہ ہے کہ یہ واقعہ امام طحاوی نے بسند صحیح روایت کیا ہے۔

مواہب میں ابن تیمیہ کی ذکر کردہ جرح پر علامہ زرقانی فرماتے ہیں۔ حدیث حضرت اسماء کی سند حسن ہے۔ ۲ اسی طرح حدیث ابوہریرۃ کی سند بھی حسن ہے۔ جبکہ علامہ سیوطی نے اس کی تصریح کی ہے یہ فرماتے ہوئے کہ اسی وجہ سے علامہ طحاوی نے اور قاضی عیاض نے اسے صحیح کہا۔ اور ابن الجوزی نے اس حدیث کو موضوعات میں ذکر کر کے غلطی کی جیسا کہ مختصر موضوعات اور النکت البدیعات میں ہم نے ذکر کیا۔ یعنی جب اصول حدیث میں یہ طے ہو چکا کہ حسن دوسری حدیث حسن کے ساتھ مل کر یا تعدد طرق کی بنا پر درجۂ صحت تک ترقی کر جاتی ہے تو حیرت بالائے حیرت تو خود ابن تیمیہ کی بات پر ہے نہ کہ علامہ قاضی عیاض کے کلام پر۔ انہوں نے تو حدیث کو ان قواعد کی روشنی میں صحیح فرمایا ہے جو الفیہ وغیرہ کتابوں میں مذکور ہیں اور کمسن طلبہ کو بھی معلوم ہیں۔ اس لئے حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں فرمایا کہ ابن الجوزی نے اس حدیث کو موضوعات میں ذکر کر کے غلطی کی۔ یوں ہی ابن تیمیہ کتاب الرد علی الروافض میں ذکر کردہ اپنے زعم وضع میں خطا کار رہے۔

(۲) اسی طرح ابن کثیر نے امام احمد اور چند حفاظ سے نقل کیا کہ انہوں نے اس حدیث کو موضوع کہا۔ شامی فرماتے ہیں ظاہر یہی ہے کہ ان حضرات کو یہ حدیث کذاب کی سند سے پہنچی اور مذکورہ معتبر طریقوں سے انہیں دستیاب نہ ہوئی۔ ورنہ ان سندوں کے ہوتے ہوئے اس حدیث کو ضعیف کہنے کی بھی گنجائش نہیں۔ موضوع ہونا تو دور کی بات ہے۔ اگر ان حضرات پر مذکورہ سندیں پیش کی جاتیں تو وہ یقیناً حدیث کی اصلیت اور عدم موضوعیت کا اعتراف کرتے ان کے بیان کردہ قواعد سے حفاظ کے اس حدیث کو اپنی معتبر کتابوں میں ذکر فرمانے سے اور اہل تائید کی تقویت سے موضوع کہنے والوں کی تردید ہو جاتی ہے۔

(۳) اسی طرح امیر جماعت وہابیہ مولوی محمد یوسف کاندھلوی نے شرح طحاوی شریف میں ابن تیمیہ کے خیال کی بھرپور تردید کرتے ہوئے حدیث مذکور کو معتبر قرار دیا ہے اور مشکل الآثار میں مذکور دونوں سندوں کے رجال کی توثیق کی ہے۔

(۴) خیر مؤلف سیرۃ النبی کے سامنے اپنے ہم جماعت مولوی محمد یوسف کاندھلوی کی تحریر تو نہ رہی ہوگی لیکن علمائے کرام کے جن ارشادات سے انہوں نے قوت حدیث کا فیصلہ کیا ہے وہ تو ضرور مؤلف کے پیش نظر تھے۔ لیکن ان کے جذبۂ تنقیص کو تسکین تو صرف ایسے ہی اقوال سے ہوتی ہے جن میں کسی حدیث فضائل کو موضوع یا کم از کم ضعیف کہا گیا ہو۔ حد تو یہ ہے کہ محدث ابن دحیہ نے ایک حدیث فضائل کو صرف غریب کہا تو ان پر بھی یہ برافروختہ ہو کر بول پڑے۔

"واقعہ یہ ہے کہ اس کو غریب کہنا بھی اس کی توثیق ہے، یہ تمام تر بے اصل اور بے بنیاد ہے۔" (ص ۱۵۷ ج ۳)

جائے حیرت تو یہ ہے کہ سورج پلٹانے کے واقعہ کو مؤلف نے صراحۃً موضوع کیوں نہ کہا۔ جب کہ ان سے پہلے امام الوہابیہ ابن تیمیہ اسے موضوع کہنے کی جسارت کر چکے ہیں۔ غالباً وجہ یہ ہوئی کہ حدیث عوام و خواص سب میں مشہور و معتبر تھی۔ خائف ہوئے کہ اگر صراحۃً موضوع کہہ دیا تو عوام بھی گرفت کر لیں گے لہٰذا کچھ اس طرح کہو کہ نگاہِ عوام میں بھرم باقی رہے۔

(۹)

حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ یا رسول اللہ میں نے آپ کو گہوارہ میں چاند سے ہمکلامی کرتے دیکھا۔ اس پر محدث صابونی نے کتاب المائتین میں فرمایا کہ یہ سند و متن دونوں کے لحاظ سے غریب ہے پھر بھی معجزات میں حسن ہے۔

علامہ زرقانی نے فرمایا۔

لان عادة المحدثين التساهل فی غیر الاحکام والعقائد مالم یکن موضوعًا۔

کیونکہ غیر احکام وعقائد میں محدثین کا شیوہ نرم روی ہے جب تک موضوع نہ ہو۔

مؤلف کے نزدیک حدیث ضعیف چونکہ موضوع کی طرح غیر احکام وعقائد یعنی باب فضائل میں بھی بے کار ہے۔ اس لئے حسب عادت دوسری ضعیف روایات کو نشانۂ تنقید بنانے کے ساتھ اسے بھی اپنی فہرست میں داخل کیا۔

مزید برآں فرماتے ہیں۔

> علاوہ ازیں حضرت عباس آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے شاید ایک ہی دو سال بڑے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شیر خوارگی کے عالم میں وہ خود شیر خوار ہوں گے۔ (ص ۵۵، ج ۳)

(۱) عالم انساب زبیر بن بکار فرماتے ہیں حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عمر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تین سال زیادہ تھی[1] علامہ قسطلانی نے اسی قول کو اختیار فرمایا۔

(۲) حضرت عباس سے یہ بھی روایت ہے۔

اذکر مولد النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم وانا ابن ثلاثة اعوام او نحوها۔

مجھے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا وقت ولادت یاد ہے اس وقت میں تقریباً تین سال کا تھا۔

(۳) شیر خوارگی کی کم سے کم مدت دو سال ہے۔ اگر اس مدت کے اخیر میں حضرت عباس کا ذکر کردہ واقعہ لیا جائے تو اس وقت ان کی عمر پانچ سال ہوگی۔ اور ابتدا میں لیا جائے تو بھی تین سال ہوتا ہے۔

(۴) اس عمر کے کسی واقعہ کو یاد رکھنا تمام بچوں کے لئے اگرچہ واقع نہ ہو لیکن بعض بچے اپنی ذکاوت وزیرکی کے باعث اس عمر کی بھی بہت سی باتیں سمجھتے

[1] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۱۲۲۔

اور یاد رکھتے ہیں۔

علامہ ابن الصلاح نے ابراہیم بن سعید جوہری کا بیان نقل کیا ہے کہ انہوں نے مامون کے دربار میں چار سال کے ایک بچے کو دیکھا جو قرآن کی قراءت اور مسائل میں نظر کیا کرتا تھا ہاں یہ تھا کہ جب اسے بھوک لگتی تو روتا۔

قاضی ابو محمد عبد اللہ بن محمد اصبہانی فرماتے ہیں کہ میں نے پانچ سال کی عمر میں قرآن حفظ کر لیا۔ لوگ ابو بکر بن المقرئ کے پاس مجھے چار سال کی عمر میں لے گئے۔ ایک شخص نے کہا یہ کمسن ہے اس کو قراءت کی سماعت نہ کراؤ۔ ابن المقرئ نے مجھ سے فرمایا سورۂ کافرون پڑھ۔ میں نے پڑھ دی۔ اسی طرح سورۂ کوثر اور سورۂ مرسلات پڑھوائی۔ میں نے پڑھ دی تو ابن المقرئ نے فرمایا اس کو سماعت کراؤ اور ذمہ میرا[1]

ابن الصلاح اپنا فیصلہ یہی رقم فرماتے ہیں کہ ہر بچے کو معین طور پر دیکھنا چاہئے اگر وہ اور بچوں سے فہم وعقل میں بالاتر ہے تو اس کا سماع صحیح ہے اگرچہ پانچ سال کا نہ ہو۔ اور اگر ایسا نہیں تو اس کا سماع درست نہیں اگرچہ پانچ سال نہیں بلکہ پچاس سال کا ہو[2]

حضرت محمود بن ربیع کی حدیث سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ محمود جیسے پانچ سالہ لڑکے کا سماع صحیح ہے۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ پانچ سال سے کم کا ہو تو اس کا سماع درست ہی نہیں[3]

علامہ نووی تقریب میں اسی فیصلہ کو برقرار رکھتے ہیں۔ علامہ جلال الدین سیوطی تدریب میں علامہ قسطلانی کی کتاب المنہج فی علوم الحدیث سے نقل کرتے ہیں۔

ما اختارہ ابن الصلاح هو التحقیق والمذهب الصحیح[4]

ابن صلاح نے جو اختیار کیا وہی تحقیق ہے اور وہی مذہب صحیح ہے۔

[1] مقدمہ ابن الصلاح ص ۶۲ مطبوعہ بمبئی۔ [2] مقدمہ ابن الصلاح ص ۶۲ مطبوعہ بمبئی۔

[3] مقدمہ ابن الصلاح ص ۶۲ مطبوعہ بمبئی۔ [4] تقریب [illegible]

(۵) اس تفصیل کا مقصد یہ ہے کہ حضرت عباس کا مولد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو یاد رکھنا اور اس سے بھی بعد کے زمانے میں چاند سے ہمکلامی کے نادر و اہم واقعہ کو سمجھنا، یاد رکھنا اور اس کے باعث عظمت رسالت کا قائل ہونا نہ عقل کے خلاف ہے نہ نقل کے معارض۔ اسی لئے اجلۂ محدثین نے باب فضائل میں اس روایت کو غرابت متن و سند کے باوجود مقبول رکھا۔ اور ضرورت انکار نہ سمجھی۔ لہٰذا تمام جہان کے علمائے اکابر کے مسلمہ اصولوں کے خلاف مؤلف سیرۃ النبی کا اعتراض چنداں قابل التفات نہیں۔

(۶) ذرا جذبۂ تضعیف اور شوق تنقید کی فراوانی بھی دیکھئے۔ زرقانی کے جس مقام سے مؤلف نے ص۷۲۸ پر "ھو فی المعجزات حسن لان عادۃ المحدثین التساھل فی غیر الاحکام والعقائد" نقل کیا ہے زرقانی نے اسی سے متصل حضرت عباس کی ولادت عام الفیل سے تین سال پہلے ہونا بتایا ہے اور صراحت فرمائی ہے کہ مصنف نے اسی پر جزم کیا ہے۔ لیکن مؤلف نے اس سے بالکل صرف نظر کر لیا۔ کیونکہ اس سے روایت کو تقویت ملتی تھی۔ لہٰذا اس قول کی طرف جھکے جس میں عمر اقدس سے حضرت عباس کی عمر دو سال زیادہ بتائی گئی ہے۔ اس سے بھی تسکین نہ ہوئی کیونکہ سمجھ رہے تھے کہ روایت میں یہ صراحت نہیں کہ قمر سے سرگوشی کا واقعہ اوائل ولادت ہی کا ہے۔ لہٰذا ہو سکتا ہے کہ دو سال کی عمر کا ہو اس وقت حضرت عباس کی عمر چار سال ہو جائے گی۔ پھر اس اہم واقعہ کو سمجھنا اور محفوظ رکھنا ممکن ہوگا اس لئے دو کا عدد گھٹانے کے لئے قلم کی یہ فنکاری دکھائی کہ "ایک ہی دو سال" بڑے تھے۔ اس پر بھی تسکین نہ ہوئی تو لفظ "شاید" کا اضافہ کر کے اور شک پیدا کیا کہ ("شاید" ایک کیا دو سال بڑے تھے) جبکہ ایک ہی سال بڑا ہونا کوئی قول نہیں خیر اس کے بعد بھی نتیجہ تو یہ نکالنا تھا کہ "جب ایک ہی سال بڑے تھے تو ممکن نہیں کہ ایک سال کی عمر میں چاند کی سرگوشی سمجھ سکے ہوں پھر سن رشد میں پہنچ کر اسے بیان کرنے کا امکان ہی ختم ہو جاتا ہے"۔ لیکن مصنف نے یہ نتیجہ حذف کر دیا اس لئے

کہ اس کا یہ جواب ہو سکتا تھا کہ روایت میں تصریح نہیں کہ یہ ابتدا ولادت ہی کا واقعہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اس دور کا واقعہ ہو جب عمر مبارک دو سال اور عمر حضرت عباس تین سال رہی ہو۔ آج بھی تین سال کے بہت سے بچے ایسے نادر و اہم واقعہ کو سمجھنے اور بتانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

لہٰذا مؤلف نے ان سب سے بچ کر ایک عجیب سا نتیجہ نکالا جسے اس بحث سے کوئی تعلق ہی نہیں کہ "آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شیر خوارگی کے زمانے میں وہ خود شیر خوار ہوں گے"۔ یہ نتیجہ بھی صیغہ شک کے ساتھ۔ اس لئے کہ اگر جزماً کہتے کہ وہ خود شیر خوار تھے تو اعتراض ہوتا کہ عمر حضرت عباس سے متعلق دو ہی قول ہیں۔ تین سال زائد۔ دو سال زائد۔ پہلے قول پر تو ولادت اقدس کے وقت ان کا زمانۂ رضاعت ختم ہونا بالکل ظاہر ہے۔ دو سال زائد مانا جائے تو دو سال پر بھی شیر خوارگی ختم ہوتی ہے اور ہو سکتی ہے۔ لہٰذا دو سال بعد بھی حضرت عباس کی شیر خواری کا بے دلیل دعویٰ بے کار ہے۔ اس لئے مؤلف نے دو کا عدد گھٹانے کے لئے ایک بھی ملایا۔ پھر اس میں بھی شاید لگایا۔ اور نتیجہ بھی ویسا ہی مشکوک نکالا۔ کہ سرکار کے عہد رضاعت میں وہ خود شیر خوار ہوں گے۔ بفرض غلط ہم مانے لیتے ہیں کہ حضرت عباس کی شیر خوارگی کا آخر زمانہ اور سرکار کی رضاعت کا ابتدائی زمانہ مشترک تھا۔ تو کیا اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ حضرت عباس کا چاند کی سرگوشی کا واقعہ کو دیکھنا، سمجھنا اور یاد رکھنا پھر بیان کرنا محال و ناممکن ہے؟؟ اب بھی احتمال ہے کہ حضور کی عمر کے دو سال پر اور ان کی عمر کے تین سال پر واقعہ سامنے آیا ہو جسے انہوں نے یاد رکھا اور بیان کیا ہو جب عمر حضرت عباس کے بارے میں آپ کا بالکل غلط تخمینہ مان لینے کے بعد بھی صحت واقعہ کا قوی احتمال باقی ہی رہ جاتا ہے تو یہ ساری خامہ فرسائی بالکل بے کار ہو گئی اور یہ ساری کاوش تقلیل فضائل کے جذبے کی غماز ٹھہری۔ مؤلف کو تو اپنے طور پر صرف ضعیف ثابت کرنے کی حاجت تھی کیونکہ ان کے نزدیک ضعیف بھی موضوع ہی کے ہم پلہ

اور ہر باب میں بے اعتبار ہے۔ اور ضعف تو محدث صابونی کے قول سے ثابت ہوگیا پھر مزید خامہ فرسائی کرکے بلاوجہ داد تحقیق حاصل کرنے کی سعی ناکام کی کیا ضرورت تھی؟ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ؎

در بساط نکتہ داناں سخن فروشی شرط نیست
یا سخن دانستہ گو اے مرد عاقل یا خموش

(۹)

حضرت کعب احبار سے ایک روایت ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جب نور مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حضرت عبدالمطلب کو سپرد ہوا تو انہوں نے ایک خواب دیکھا جس کی تعبیر انہوں نے ایک کاہن سے حاصل کی۔ اس نے حکم دیا کہ اس جوان کی شادی کر دی جائے۔ اس وقت نور مصطفےٰ کے اثر سے ان کے بدن سے مشک کی خوشبو آتی تھی اور وہ نور ان کی پیشانی میں چمکتا تھا۔ قریش پر جب کوئی مصیبت آتی تھی تو اس نور کے وسیلے سے دعا مانگتے تھے اور قبول ہوتی تھی۔

یہ باب فضائل کی ایک حدیث ہے جسے احکام سے بحث نہیں۔ اسے ماننے سے نہ عقائد اسلام پر ضرب آتی ہے نہ دین کا کوئی رکن منہدم ہوتا ہے مگر مؤلف سیرۃ النبی نے حسب عادت اسے بے اعتبار قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ یہ روایت ابوبکر بن ابی مریم نامی راوی کے باعث ضعیف ہے۔ ابوبکر بن ابی مریم کو محدثین نے صرف اس لئے ضعیف کہا ہے کہ ایک حادثہ کے باعث ان کا دماغ ٹھیک نہ رہا دروغ و کذب کی کوئی تہمت ان پر نہیں۔ حدیث ضعیف محدثین کرام اور علمائے اسلام کے نزدیک باب فضائل میں معتبر ہے۔ مؤلف کے نزدیک فضائل میں بھی بے اعتبار ہے۔ اس لئے یہ روایت اور جتنی ضعیف روایات پر مؤلف نے صفحات سیاہ کئے ہیں ان کے جواب کے لئے یہی کافی ہے کہ باب فضائل میں ضعیف معتبر ہے۔ خاص اس روایت کو ان کے ذوق تنقید اور جذبات باطنی کے چند نمونے پیش کرنے کے لئے ذکر کیا جا رہا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

یہ روایت ابوسعد نیشاپوری المتوفی ۴۰۷ھ نے اپنی کتاب شرف المصطفےٰ میں ابوبکر بن ابی مریم کے واسطے سے کعب احبار (نومسلم یہودی) تابعی سے نقل کی ہے۔ اول تو یہ سلسلہ ایک تابعی تک موقوف ہے آگے کی سند نہیں۔ علاوہ ازیں کعب احبار گو نومسلم اسرائیلیوں میں سب سے بہتر سمجھے جاتے تھے۔ تاہم امام بخاری ان کے کذب کا تجربہ بیان کرتے ہیں۔ اسلام میں اسرائیلیات اور عجیب و غریب حوادثات کی روایات کے سرچشمہ یہی ہیں۔
(سیرۃ النبی ص ۴۰۷ ج ۳)

(۱) حضرت کعب احبار ایسے جلیل القدر تابعی ہیں کہ اجلہ صحابہ کرام نے ان سے روایت کی۔ جن میں حضرت ابوہریرہ، حضرت انس، حضرت عبداللہ بن عمر حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہم بھی شامل ہیں۔ اب اگر صرف امام بخاری ان سے روایت نہ کریں تو ان کی جلالت شان میں کیا فرق آسکتا ہے۔ علاوہ ازیں امام مسلم، ترمذی، نسائی، ابوداؤد، ابن ماجہ باستثنائے امام بخاری تمام اصحاب ستہ نے ان سے روایت کی ہے امام بخاری کو حضرت معاویہ سے ایک خبر ملی۔

ان کان لمن اصدق هولاء المحدثین الذین یحدثون عن اهل الکتاب، وان کنا مع ذلک نبلو علیه الکذب۔

بلاشبہ یہ اہل کتاب سے روایت کرنے والوں میں سب سے زیادہ راست باز تھے۔ اس کے باوجود ہم ان پر کذب کا تجربہ کرتے۔

اولاً عربی میں کذب بلا قصد سہواً یا خطأً خلاف واقعہ بات بیان کر جانے کو بھی کہتے ہیں اس معنی کے پیش نظر ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ قصداً جھوٹ بولتے تھے۔

ثانیاً حضرت معاویہ کی یہ روایت خود محل نظر ہے اگر کعب احبار کا کذب

ثابت ہوتا تو اجلہ صحابہ کرام جو ان کے ہم زمانہ اور قریبی تھے وہ یقیناً ان سے روایت ترک کر دیتے ۔ خصوصاً بعد کے محدثین ضرور ان کو ساقط الاعتبار مانتے۔ لیکن امام بخاری کی جرح ائمہ نقد کے نزدیک قابل اعتنا نہ ٹھہری لہٰذا سب نے حضرت کعب احبار کو ثقہ اور مستند تسلیم کیا ہے ۔ ارباب نقد کے قول فیصل کے بعد امام بخاری کی جرح کا تذکرہ بالکل بے سود ہے۔

(۲) کعب احبار تابعی کہہ کے مؤلف نے عوام پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ زمانۂ رسالت سے بہت بعد کے ہیں۔ ضروری ہے کہ ان کی روایات کا مرجع کوئی صحابی ہوں ۔ حالانکہ یہ کوئی احکام سے متعلق واقعہ نہیں جس کی انتہا صحابی پر ضروری ہو۔ تاریخ کا ایک واقعہ ہے جو حضرت عبدالمطلب کے ساتھ اور ان کے زمانہ میں پیش آیا۔ لہٰذا اس زمانہ کے لوگوں سے بلا واسطہ یا بالواسطہ سننا کافی ہے۔

اب یہ ملاحظہ کیجئے کہ کعب احبار اگرچہ عہدِ صدیقی یا عہدِ فاروقی میں مسلمان ہوئے لیکن باتفاق محدثین انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا زمانہ پایا اور ۳۲ھ (عہد عثمانی) میں وفات پائی جب کہ ان کی عمر سو سال سے بھی زیادہ ہو چکی تھی لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ولادت کے وقت یہ کم از کم پندرہ برس کے رہے ہوں گے اس وقت حضرت عبدالمطلب بھی زندہ تھے اور کوئی مجہول شخصیت نہ تھے قریش کے سردار اور مرجع زمانہ تھے۔ مکہ بھی کوئی گمنام شہر نہ تھا۔ مشہورِ خلائق اور ماوائے عرب تھا۔ عام مصائب وحوادثات کے وقت نور مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے وسیلے سے دعائیں مانگنے کے واقعات بھی کوئی ڈھکے چھپے رہنے والے نہ تھے۔ یقیناً عوام وخواص میں ان آیاتِ نبوت کی شہرت تھی اس لئے حضرت کعب احبار کا خود حضرت عبدالمطلب یا اس دور کے کثیر افراد سے ان واقعات کا معلوم کر لینا ذرا بھی بعید نہیں۔ لیکن ان تمام حقائق کو مؤلف نے اس طرح پامال کرنے کی کوشش کی ہے کہ "یہ روایت کعب احبار

تابعی پر موقوف ہے وہ آگے کی سند نہیں بتاتے" ۔ عام قاری سوچے گا کہ ہاں تابعی کو تو صحابی کا نام ضرور لینا چاہیئے۔ یہ کتنے لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ تابعی خود اتنے جلیل القدر اور عمر دراز ہیں کہ صحابہ ان سے روایت کرتے ۔ اور حضرت عبدالمطلب کے زمانہ میں بنفس نفیس موجود تھے یہی نہیں بلکہ اس وقت جوان تھے۔ ان کے لئے عبدالمطلب اور اہل حجاز سے متعلق ایک تاریخی واقعہ میں صحابی سے روایت کیا ضروری ہے؟ یہ واقعہ ہی اس وقت کا ہے جب کوئی صحابی ہی نہ تھا۔ درجہ صحابیت سے شرفیاب ہونے کا سلسلہ تو اس کے مدتوں بعد شروع ہوا۔

(۳) سب سے دلآزار طرز تنقید یہ ہے کہ باب فضائل کی ایک روایت کو ساقط الاعتبار کرنے کے لئے حضرت کعب احبار جیسے ثقہ متورع استاذِ صحابہ بزرگ کے لئے مؤلف نے "نومسلم یہودی" کا لفظ منتخب کیا۔ کیا اگر کوئی کافر اسلام لائے تو اس کو صرف نومسلم کہا جائے گا یا نومسلم کافر کہا جائے گا؟ بعد اسلام بھی اس پر کافر کا اطلاق جائز ہو سکتا ہے؟؟ پھر وہ زمانہ تو ایسا ہی تھا کہ برابر کثرت سے لوگ داخل اسلام ہوا کرتے تھے۔ اس وقت انہیں کوئی نومسلم کہتا تو کہہ سکتا تھا لیکن جب ان حضرات نے اسلام کی بلند پایہ خدمات انجام دیں۔ کفر وشرک کے آثار اپنی ذات ہی سے نہیں بلکہ جہان سے مٹائے اور اسلامی دنیا میں عظیم الشان مرتبے حاصل کئے تو اب انہیں "نومسلم" کے لقب سے بھی یاد کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ ۔ اگر یہ بتانا ہی ہو کہ سابقاً ان کا مذہب کیا تھا تو صاف لفظوں میں کہا جائے گا کہ فلاں صحابی یا تابعی پہلے دین یہودیت یا نصرانیت وغیرہ پر تھے آج انہیں نومسلم کہنا کسی طرح زیبا نہیں۔ خصوصاً حضرت کعب احبار جیسے عظیم المرتبت بزرگ کو "نومسلم" یا سابق الیہودیۃ نومسلم ہی نہیں بلکہ صراحۃً "نومسلم یہودی" کہنا عجیب گستاخانہ ذہنیت کا عکاس ہے۔ اور یہ ساری گستاخی ودل آزاری اس لئے روا رکھی گئی ہے کہ انہوں نے فضائل سرکار سے متعلق ایک تاریخی یادگار بیان

کردی ہے لہٰذا روایت کو بے اعتبار ٹھہرانے کے لئے ان کو بھی خواہ مخواہ بے وقعت دکھانا ضروری ہوا۔

(۴) مؤلف نے اسلام میں اسرائیلیات اور عجیب و غریب حوادث کا سرچشمہ صرف حضرت کعب احبار کو کہا ہے۔ اور ان کے استاذ شبلی نعمانی نے اپنے مقالات میں کئی تابعین و محدثین کی ایک فہرست سنائی ہے اور سب پر دل کھول کر جرح و قدح کا تماشا دکھایا ہے۔ اب یہ فیصلہ کون کرے کہ استاذ صاحب سچے ہیں یا شاگرد صاحب؟

(۵) اسرائیلیات کی رٹ اور اس کی تحقیر و تذلیل شبلی گروپ کی کتابوں میں زور و شور سے پائی جاتی ہے۔ یہ لوگ تمام تر اسرائیلی روایات کو دفتر اکاذیب سے زیادہ حیثیت نہیں دیتے حالانکہ حق یہ ہے کہ جملہ اسرائیلیات بے کار نہیں۔ مگر ان حضرات کا جوشِ تحقیق اس وقت تک تھمتا نہیں جب تک کہ اکابر علمائے اسلام کی ہوا خیزی سے سیر نہ ہولیں۔ یا تو یہ ان کی فطرت ہے یا پھر مستشرقین سے غیر معمولی مرعوبیت کا نتیجہ۔

مقالات شبلی میں اسرائیلی روایات کی بے اعتباری کا ایک سبب تو انہوں نے ان محدثین کو قرار دیا ہے جن کی روایات بعض حضرات کے نزدیک مجروح ہیں۔ اور جن میں بعض حضرات باب احکام میں معتمد نہیں۔ لیکن درحقیقت یہ تنقید اسی خیال پر مبنی ہے کہ احکام اور قصص میں فرق نہیں۔ ہر ایک کے لئے اعلیٰ درجہ کا ثقہ ہونا شرط ہے۔ یہ خیال نقلاً بھی غلط ہے اور عقلاً بھی۔ تفصیل ہمارے ان دلائل و شواہد سے سمجھی جاسکتی ہے جو باب فضائل میں اعتبار حدیث کے اصول و قواعد کے تحت ذکر ہو چکے ہیں خود ساختہ اصولوں سے معتبر کتابوں کو ساقط الاعتبار قرار دینا ان لوگوں کا نہایت خوشنما فن ہے۔

دوسرا سبب آزاد خیال معتزلی مورخ عبدالرحمٰن ابن خلدون سے تفصیلاً نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں:-

"انبیاء اور صلحائے سابقین کے افسانے جو یہودیوں میں پھیلے ہوئے تھے وہ نہایت مبالغہ آمیز اور دور از کار تھے قرآن مجید میں نہایت اجمال کے ساتھ صرف ان واقعات کو بیان کیا تھا جو فی نفسہ صحیح تھے اور جن سے طبائع پر کوئی اخلاقی عمدہ اثر پڑتا تھا ہمارے مفسروں نے قرآن مجید کو ایک متن قرار دیا۔ اور اس کی شرح میں وہ تمام بے ہودہ افسانے شامل کر دئے، جن کے سامنے بوستانِ خیال کی بھی کچھ حقیقت نہیں، حقائق اشیا کے متعلق جو کچھ قرآن مجید میں مذکور تھا اس کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا، چاہ بابل، کوہ قاف، سکندر ذوالقرنین، یاجوج ماجوج وغیرہ وغیرہ کی نسبت جو روایتیں مسلمانوں میں پھیلی ہیں وہ ان ہی تفسیروں کی بدولت ہیں ـــ علامہ ابن خلدون نے اس کے متعلق مقدمۂ تاریخ میں "نہایت محققانہ" مضمون لکھا ہے ہم اس کی عبارت اس موقع پر بقدر ضرورت نقل کرتے ہیں"۔ (مقالات شبلی ج ۱ ص ۳۱ معارف پریس ۱۳۷۳ھ)

اب اس عبارت کا پورا ترجمہ مقالات شبلی سے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔ کتنی نادر تحقیق ہے جو "علامہ" کو پسند آگئی اور سند کے طور پر نقل فرمائی۔

"اور اس باب میں متقدمین نے بڑا ذخیرہ جمع کیا ہے لیکن ان کی تصنیفات اور روایتوں میں نیک و بد مقبول و مردود سب کچھ شامل ہے ـــ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل عرب لکھے پڑھے نہ تھے اور ان پر بالکل بدویت اور جہالت غالب تھی اور جب ان کو اشیاء کی دریافت کا شوق ہوتا تھا جو طبائع بشری کا اقتضا ہے۔ مثلاً آفرینش عالم کے اسباب، دنیا کی ابتدا، وجود کے اسرار، تو ان باتوں کو وہ لوگ یہودیوں سے دریافت کرتے تھے۔ یا ان عیسائیوں سے جو یہودیوں کے مقلد تھے ـــ اور اس زمانے کے یہود ایسے ہی جاہل تھے جیسے بادیہ نشین عرب۔

ان کو صرف وہی معلومات تھیں جو عوام اہل کتاب کو ہوتی ہیں۔ پھر جب یہ لوگ اسلام لائے تو ان امور کے متعلق جو احکام شرعی سے تعلق نہیں رکھتے تھے، مثلاً دنیا کا آغاز، واقعات قدیمہ اور قصص انبیاء ان کے خیالات وہی رہے جو پہلے سے تھے۔ ان اسلام لانے والوں میں کعب احبار، وہب بن منبہ، عبداللہ بن سلام، وغیرہ تھے۔ اس لئے تمام تفسیریں ان کی روایتوں سے بھر گئیں۔ اور اس قسم کے امور میں مفسرین سہل انگاری کرتے ہیں اس لئے ان لوگوں نے تفسیر کی کتابوں کو انہیں روایتوں سے بھر دیا اور جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں ان روایتوں کا ماخذ وہی توراۃ والے تھے۔ جو صحرانشین تھے۔ اور ان کو ان روایتوں کے متعلق کچھ تحقیق حاصل نہ تھی۔ لیکن چونکہ مذہبًا ان لوگوں کا پایہ بلند تھا۔ اور قوم میں ان کو شہرت اور عظمت حاصل تھی۔ اس لئے وہ روایتیں قبول عام پا گئیں۔ (مقالات شبلی صـ۳۲)

غور کیجئے کتنی بلند پایہ تحقیق ہے۔ سوائے ظن و تخمین کے دلیل و ثبوت کا کہیں نام و نشان بھی نہیں۔

(الف) دعویٰ ہے کہ جاہل عرب جاہل یہود سے معلوم کرتے۔ اس کی دلیل کیا ہے۔ یہ کس روایت سے ثابت ہے اگر روایت پیش بھی کریں تو وہ صرف تاریخی ہوگی۔ محدثانہ تنقید پر صحیح اتر نہیں سکتی۔ اور ان کے نزدیک احکام ہی نہیں تاریخ و سیر میں بھی صحت روایت ضروری ہے۔

(ب) دعویٰ ہے کہ اس زمانہ کے یہود ایسے ہی جاہل تھے جیسے بادیہ نشین عرب۔ اور جب یہ لوگ اسلام لائے تو ان لوگوں کے وہی پرانے خیالات رہ گئے اسلام لانے والوں میں کعب احبار، وہب بن منبہ اور عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہم کے نام خصوصیت سے پیش کئے ہیں۔

عام پڑھے لکھے لوگوں کو بھی معلوم ہے کہ یہ حضرات قبل اسلام اکابر علمائے یہود

سے تھے۔ ان کے پاس کتب یہود کا علم کثیر موجود تھا پھر ان حضرات کو بادیہ نشین جاہلان عرب کی صف میں کھڑا کر دینا تاریخ اور دیانت کے ساتھ کتنا بڑا ظلم ہے۔

جب ایسے علما داخل اسلام ہوئے جو صحیح طور سے کتاب داں یہود تھے۔ اور ان کتب سے انہوں نے ایسی باتیں بیان کیں جو قرآن و سنت کے خلاف نہیں، نہ عقل سلیم کے معارض۔ تو پھر وہ باتیں بے اعتبار کیوں ہو گئیں؟۔ اور انہیں مان لینے سے دین کی کون سی بنیاد منہدم ہوئی جا رہی ہے؟

عقائد و احکام اور تاریخ و قصص میں فرق نہ کرنا اور سب کو ایک پلہ میں رکھنا صریح بے عقلی ہے۔ مقاصد و مراتب کو نظر انداز کر کے وہ تنقیدیں جو روایات احکام پر ہوتی ہیں تاریخ و قصص اور فضائل و سیر پر چسپاں کرنا کوئی علمی کمال نہیں بلکہ جذبہ انا کی تسکین، یا غیروں سے مرعوبیت یا جہالت و سفاہت کی دلیل ہے۔

(ج) خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد صحیح بخاری شریف میں موجود ہے حدثوا عن بنی اسرائیل ولا حرج بنی اسرائیل سے روایت کرو۔ کوئی حرج نہیں۔ امام علماء ہند شیخ محقق شاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس کی شرح میں فرماتے ہیں۔

نیست گناہے در حدیث کردن	اور ان سے روایت کرنے میں کوئی
از ایشاں۔ یا مراد آں ست کہ نیست در	گناہ نہیں۔ یا یہ مراد ہے کہ بنی اسرائیل سے
تحدیث از بنی اسرائیل تنگی بوجوب احتیاط	روایت کرنے میں عادل ثقہ ضابط سے
و رعایت اتصال سند بنقل از عدل ثقہ	نقل میں اتصال سند کی رعایت اور وجوب
ضابط۔ چوں سابقا از خواندن توریت	احتیاط کی تنگی نہیں۔ چونکہ سرکار نے
و نوشتن آں منع کردہ فرمودہ بود مگر متحیر شما	پہلے توریت پڑھنے لکھنے سے ان الفاظ
در کار دین خود و کتاب خود کہ دست بتوریت	میں منع فرمایا تھا کہ "شاید تم لوگ اپنے
می زنید"۔ چناں کہ در فصل ثالث از	دین و کتاب۔ کے معاملہ میں متحیر ہو کہ توریت

باب سابق از حدیث جابر گزشت۔ رخصت کرد پس از آں وفرمود کہ اگر قصص ومواعظ وامثال کہ از ایشاں بشنوید و بداں تحدیث کنید نہ شرائع واحکام کہ منسوخ است مانع نیست۔ ودر کتاب ایشاں آیات غریبہ ووقائع عجیبہ ہست کہ میتواں نقل کرد واگر در رعایت در تصحیح نقل وسند مساہلہ رود نیز غم نیست چہ مقصود عبرت وایقاظ ست وایں باب وسعتے دارد برقیاس آں کہ گفتہ اند عمل بحدیث ضعیف در فضائل اعمال جائز است کذا قالوا۔ (ص ۱۵۱ ج ۱ اشعۃ اللمعات طبع نہم مطبع نسیج کمار لکھنؤ ۱۳۸۳ھ/۱۹۶۴ء)

پر ہاتھ لگاتے ہو (اور اس سے خوشہ چینی کر رہے ہو) جیسا کہ یہ گزشتہ باب کی تیسری فصل میں حضرت جابر کی حدیث کے تحت گزرا۔ اس لئے اس کے بعد حضور نے رخصت دے دی کہ شرائع واحکام جو منسوخ ہو چکے ہیں وہ نہیں بلکہ قصص، مواعظ اور امثال اگر ان سے سنو اور بیان کرو تو کوئی رکاوٹ نہیں۔ ان کی کتاب میں ایسی نادر نشانیوں اور عجیب واقعات کا بیان ہے جو نقل کئے جاسکتے ہیں۔ اگر تصحیح نقل وسند میں سہل ڈھیلا ہو تو بھی غم نہیں کیونکہ عبرت وتنبیہ مقصود ہے اور اس باب میں وسعت ہے اس قیاس کے تحت کہ علما فرماتے ہیں فضائل اعمال میں حدیث ضعیف پر عمل جائز ہے اہل علم نے ایسا ہی بیان کیا۔

علامہ ابن کثیر بدایہ ونہایہ کے شروع میں لکھتے ہیں:۔

ونسنا نذکر من الاسرائیلیات الا ما اذن الشارع فی نقلہ مما لا یخالف کتاب اللہ وسنۃ رسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔

ہم اسرائیلیات میں سے وہی ذکر کریں گے جن کے نقل کی صاحب شریعت نے اجازت دی ہے یعنی وہ جو کتاب وسنت کے خلاف نہیں ہیں۔

حدیث صریح اور ارشادات علما کے ہوتے ہوئے ابن خلدون معتزلی اور اس کے متبعین کی بے جا تشدد پسندیوں کی کیا حقیقت رہ جاتی ہے۔ آزاد خیالوں کا عجیب حال ہے باب احکام میں فقہا نے سختی رکھی تو وہاں یہ نرمی چاہتے ہیں اور شدت کے شاکی ہوتے ہیں۔ اور باب فضائل وسیر اور تاریخ وقصص وغیرہ میں

نرمی رکھی تو وہاں شدت چاہتے ہیں۔ اور نرمی کی شکایت کرتے ہیں۔ یہ دین و دانش کی پیروی نہیں بلکہ ہوائے نفس کی اطاعت ہے۔

(۶) حدیث پاک، شیخ محقق علیہ الرحمہ کی تشریح، ارشادات علما اور عبارت ابن کثیر سے معلوم ہوا کہ اسرائیلیات جو کتاب وسنت کے خلاف نہ ہوں ان کی روایت بجا ہے ــــ یہ ان لوگوں کے لئے اجازت ہے جو خود کتب یہود سے آشنا نہ تھے۔ بلکہ یہود سے زبانی طور پر معلوم کر سکتے تھے ــــ پھر کعب احبار جیسے وہ اکابر علما جو کتب یہود کے امین وراز داں تھے انہوں نے اگر باضابطہ تحقیقی طور پر تاریخ وقصص کو ان کتابوں سے بیان کیا تو ان پر نقد وعیب چینی کی کون سی گنجائش رہ جاتی ہے؟ مگر فرط تحقیق اور جوش تنقیص میں ایسے ہی کرشمے رونما ہوتے ہیں۔

(۷) کسی واقعہ کا عجیب وغریب ہونا اس کے کذب کی دلیل نہیں ــــ بہت سے عجائب وغرائب خود ہماری نظروں سے گزرتے ہیں جن کے کذب کا نظر مشاہدہ میں کوئی احتمال ہی نہیں۔ ہمیں ان واقعات سے نفرت وکدورت نہیں ہوتی بلکہ عبرت وموعظت ملتی ہے۔ اگر بنی اسرائیل کے واقعات بھی یہ کام دیتے ہیں تو صرف ندرت وغرابت کی بنا پر رد نہیں کئے جاسکتے۔ کیا عہد اسلام میں عجائب وغرائب رونما نہیں ہوئے ہیں۔ ہماری معتبر کتابوں میں وہ بھی محفوظ ہیں۔ اگر غرابت باعث رد ہو تو وہ بھی مردود ہوں گے۔ اور یہ فرق ہرگز قابل قبول نہ ہوگا کہ یہ عہد اسلام کے ہیں تو مقبول اور وہ عہد ماقبل کے ہیں لہٰذا مردود؟۔

ان تفصیلات کا مقصد یہ مشاہدہ کرانا ہے کہ جب یہ لوگ روایات کو رد کرنے پر آتے ہیں تو نئے نئے قواعد تراشتے ہیں، گستاخی وتوہین پر اتر آتے ہیں ــ کمالات کو بھی عیوب کی صف میں لا کھڑا کر دیتے ہیں اور رواۃ وروایات کو بے اعتبار دکھانے کی سعی ناکام میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے ہیں ــــ واللہ الہادی الی سواء السبیل۔

(۱۱)

ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں :۔

قرآن مجید اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ انبیا کے گزشتہ صحیفوں میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی پیشگوئیاں ہیں، اور ان کے مطابق یہود و نصاریٰ کو ایک آنے والے پیغمبر کا انتظار تھا۔ اس واقعہ کو "دروغ گو راویوں" نے یہاں تک وسعت دی کہ یہودیوں کو دن، تاریخ، سال، وقت اور مقام سب کچھ معلوم تھا۔ چنانچہ ولادت نبوی سے قبل علمائے یہود ان سب کا پتہ بتایا کرتے تھے اور عیسائی راہبوں کو تو ایک ایک خط و خال معلوم تھا۔ بلکہ پرانے گھرانوں اور دیروں اور کلیسوں میں ایسی مخفی کتابیں موجود تھیں جن میں آپ کا تمام حلیہ لکھا تھا۔ اور اگلے لوگ ان کو چھپا چھپا کر رکھتے تھے۔ بلکہ بعض دیروں میں تو آپ کی تصویر تک موجود تھی۔ توراۃ و انجیل میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بعض پیشگوئیاں حقیقت میں موجود تھیں، اور وہ آج بھی ہیں، لیکن وہ استعارات و کنایات اور مجمل عبارتوں میں ہیں۔ ان کو ضعیف و موضوع روایتوں میں صاف صاف آپ کے نام و مقام کی تخصیص و تعیین کے ساتھ پھیلایا گیا۔

(سیرۃ النبی سوم ص۷۳۳)

(۱) جتنی روایات میں یہ آیا ہے کہ یہود و نصاریٰ کے کسی عالم کو دن، تاریخ کا علم تھا۔ وہ سب موضوع ہیں۔ یا ان کے راوی دروغ گو ہیں یہ بہت بڑا دعویٰ ہے جسے صبح قیامت تک ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) اسی لئے مؤلف نے آخری سطروں میں اپنے لئے گنجائش پیدا کرتے

ہوئے ایک لفظ بڑھایا اور لکھا کہ "ان کو ضعیف" و موضوع روایتوں میں صاف صاف آپ کے نام و مقام کی تخصیص و تعیین کے ساتھ پھیلایا گیا"۔ تاکہ اگر موضوع ہونا ثابت نہ ہو سکا تو ضعیف ثابت کرنا تو اپنے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ جب واقعہ بحیرا کے ثقہ رواۃ بخاری کو ساقط الاعتبار دکھا دینا روشنائی و قلم کا ادنیٰ کرشمہ ہے تو دیگر رواۃ کی ثقاہت پر حرف گیری کیا مشکل ہے؟۔

(۳) چنانچہ اس سلسلہ کی ایک روایت ابو یوسف یعقوب بن سفیان فسوی (م ۲۷۷ھ) نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کی ہے۔ فرماتی ہیں کہ مکہ میں ایک یہودی رہتا تھا۔ جس رات رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی اس نے قریش سے پوچھا تمہارے یہاں اس رات کوئی بچہ پیدا ہوا ہے؟ لوگوں نے کہا ہمیں معلوم نہیں۔ اس نے کہا پتہ لگاؤ کیونکہ اس رات اس امت کا نبی پیدا ہوا ہے اس کے کاندھوں کے درمیان ایک علامت ہے۔ لوگوں نے معلوم کیا کہ عبداللہ بن عبدالمطلب کے ایک لڑکا پیدا ہوا ہے۔ لوگوں کے ساتھ یہودی حضور کی ماں کے یہاں حاضر ہوا۔ انہوں نے لوگوں کو دکھایا جب یہودی نے علامت دیکھ لی تو بے ہوش کر گر پڑا اور کہا نبوت بنی اسرائیل سے نکل گئی۔ سن لو کہ یہ تمہیں اس طرح زیر کرے گا کہ اس کا شہرہ مشرق سے مغرب تک پھیل جائے گا۔ اس روایت کو علامہ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری شرح بخاری میں "حسن" بتایا[1] حاکم نے بھی مستدرک میں اسے روایت کر کے صحیح کہا۔ مگر مؤلف نے اسے ضعیف ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

(الف) لکھتے ہیں :۔ "حافظ ذہبی نے تلخیص مستدرک (ج ۲ ص ۶۰۲) میں حاکم کی تردید کی ہے" یہ وضاحت نہ فرمائی کہ الفاظ تردید کیا ہیں تاکہ راز طشت از بام نہ ہو۔

[1] زرقانی جلد ۱ ص ۱۲۱

(ب) فرماتے ہیں:۔ "اس کا سلسلہ روایت یہ ہے کہ یعقوب ابن سفیان فسوی، ابوغسان محمد یحییٰ کنانی سے اور یہ اپنے باپ (یحییٰ بن علی کنانی) سے اور وہ محمد بن اسحٰق (مصنف سیرت) سے روایت کرتے ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ابن اسحٰق نے خود اپنی سیرت میں یہ روایت نہیں لی ہے"۔۔۔ کاش دانشمندی سے مولانا نے اس صغریٰ کا کبریٰ حذف کر دیا۔ اس کے بعد یہ بھی لکھنا چاہئے تھا کہ جو روایت مصنف نے خود اپنی کتاب میں درج نہ کی ہو اگر کوئی ثقہ بھی اسے اس سے روایت کرے تو وہ ناقابل اعتبار ہے۔۔۔ نتیجۃً مصنفین سے سیکڑوں روایات جو محدثین زبانی نقل کرتے ہیں ان سب کا صفایا ہو جاتا۔ امام زہری کی کتاب میں جو روایت نہ ہو اب کوئی بھی ان سے روایت کرے مردود۔۔۔ امام بخاری کی کتاب میں جو روایت نہیں امام ترمذی بحوالہ بخاری بیان کرتے رہیں مردود۔۔۔ عجب اصول ہے اور عجب تنقید۔ جو ایسے ہی محققین کو زیب دیتی ہے۔

(ج) "ابوغسان محمد بن یحییٰ کو گو بعض محدثین نے اچھا کہا ہے۔ مگر محدث سلیمانی نے ان کو منکر الحدیث کہا ہے۔ ابن حزم نے ان کو مجہول کہا ہے"۔
(سیرۃ النبی)

شمس الدین ذہبی اور علامہ ابن حجر عسقلانی نے محدث سلیمانی اور ابن حزم کی صراحۃً تردید کر دی ہے۔ مگر مؤلف دیدہ و دانستہ وہی مردود جرح نقل کرتے جا رہے ہیں کہ جیسے ہی غلط سلط الفاظِ جرح زیادہ ہوں، نظرِ عوام میں روایت کا ضعف ثابت ہوتا جائے گا۔۔۔ تذہیب اور تہذیب میں ہے کہ ابو حاتم نے انہیں شیخ کہا۔ نسائی نے "لیس بہ بأس" کہا۔ ابن حبان نے ثقات میں ذکر کیا۔۔۔ اسی پر بس نہیں عمر بن شیبہ نے فرمایا وہ، ان کے والد، ان کے دادا، نانا اور ان کے چچا سب کاتب تھے۔ حافظ ابوبکر بن مفوز شاطبی نے کہا یہ مشہور ثقات میں سے ایک تھے۔۔۔ حدیث، ادب اور تفسیر کے

عالم اور علم و ہوشمندی والے گھرانے کے ایک فرد تھے۔۔۔

ان تصریحات سے واضح ہو جاتا ہے کہ صرف ابوغسان ہی نہیں بلکہ ان کے والد اور ان کا سارا گھرانا معروف و مشہور تھا۔ پھر مؤلف کا یہ فرمانا کتنی کھلی ہوئی خیانت ہے کہ۔

(د) "بہرحال ان تک غنیمت ہے مگر ان کے باپ یحییٰ بن علی کا کہیں کوئی ذکر نہیں کہ یہ کون تھے؟ اور کب تھے؟۔"

آپ نے دیکھا کہ ایک حدیثِ حسن کو کس بے دردی کے ساتھ ضعیف بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔۔۔ کیوں؟۔۔۔ صرف اس لئے کہ اس کا تعلق فضائلِ رسول سے ہے۔

(۴) "تورات و انجیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بعض پیشین گوئیاں حقیقت میں موجود تھیں اور وہ آج بھی ہیں"۔۔۔

کس قدر الٹی بات ہے جو قرآن کریم اور نقل متواتر کے بالکل خلاف ہے۔ خود قرآن فرماتا ہے کہ یہود نے آیات الٰہیہ اور صحائف آسمانی میں تحریف کی۔ قرآن و تفسیر اور نقل متواتر سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اوصافِ جمیلہ علمائے یہود نے اپنی کتابوں سے نکال دئے یا بدل دئے۔۔۔ مگر جناب مؤلف فرما رہے ہیں کہ "جو پیشین گوئیاں تورات و انجیل میں پہلے تھیں وہ آج بھی ہیں"۔۔۔ جس کا صریح معنیٰ یہی ہے کہ قرآن اور کتب اسلامی میں چودہ سو برس سے جو اعلان ہو رہا ہے کہ نعت رسول میں تحریفیں ہوئیں یہ سارا اعلان غلط ہے۔۔۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے متعلق پیشین گوئیوں میں کوئی تحریف نہ ہوئی، جیسے پہلے تھیں آج بھی ہیں۔ ہاں غلط ہیں تو اہل کتاب علما میں سے اسلام لانے والے حضرات کی وہ روایات جن میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی آمد اور اوصاف کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

پھر یہ سمجھنا کہ علمائے اہل کتاب کا ذریعہ علم محض کتب آسمانی ہی تھیں، صرف

کوتاہ اندیشی کا نتیجہ ہے ۔ جس طرح ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی دو قسم کی ہے (۱) وحی متلو (قرآن کریم) (۲) وحی غیر متلو ۔ (احادیث کریمہ) اسی طرح گزشتہ انبیاء و رسل نے بھی تو اپنی امتوں کو تعلیم الٰہی کے نتیجہ میں بہت سے ایسے ارشادات و اطلاعات سے نوازا ہے جو ان کی وحی متلو (صحائف آسمانی) میں نہ تھے اور ان کی امت کے علما نے ان ارشادات کو اپنے سینوں میں محفوظ رکھا اور بعد والوں سے روایت کیا ۔ ان کی روایات بھی قبول اسلام کے بعد صداقت و عدالت کے مراتب سے سرفراز ہونے کے بعد ہو رہی ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ ان روایات کو صرف اس بنا پر رد کر دیا جائے کہ ان میں نام و مقام وغیرہ کی وہ تفصیلات ہیں جو آج کی تحریف شدہ تورات و انجیل میں نہیں ۔ فرض کیجئے کہ غیر تحریف شدہ تورات و انجیل میں بھی وہ تفصیلات نہ رہی ہوں لیکن علمائے اہل کتاب نے انبیائے کرام سے سن کر بیان کیا ہو اور قول رسول کا دلیلِ یقینی ہونا اہل اسلام کا مسلمہ عقیدہ ہے ۔ تو پھر ثقہ لوگوں کے ذریعہ نقل شدہ وہ ارشادات ساقط الاعتبار کیوں ہوں گے ؟ خصوصاً باب فضائل میں جہاں وہ ثقاہت اور وہ شرائط بھی ضروری نہیں جو باب احکام میں لازم ہیں بلکہ یہاں تو ضعاف بھی معتبر ہوں گی اور صحیح و حسن روایات کو رد کرنے کا تو مؤلف کے خود ساختہ اصولوں کی بنیاد پر بھی کوئی سبب نہیں ۔ لیکن مؤلف نے طے کر رکھا ہے کہ وہ تمام روایات جن میں خاتم النبیین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے متعلق نام و مقام اور اوقات و حالات کی تفصیلات ہیں وہ سب ساقط الاعتبار ہیں اس لئے حسن روایات کو بھی ضعیف بنانے کی سعیِ ناکام فرمائی ہے جیسا کہ تفصیلاً آپ ابھی ملاحظہ کر چکے ۔

(۱۲)

امام واقدی محمد بن عمر سیر و مغازی کے مسلم امام ہیں مگر ان کو ساقط الاعتبار قرار دینے کے لیے براہ اپنی حد سے گزر چکے ہیں ۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں ۔

ابن سعد میں یہ روایت واقدی کے حوالے سے ہے جس کی دروغ گوئی محتاج بیان نہیں ۔ (سیرۃ النبی ج ۳ ص ۷۴۴)

پہلی روایت کا ماخذ واقدی کی داستانیں ہیں (ج ۳ ص ۷۵۹)

واقدی کی لغو بیانی مسلمہ عام ہے (شبلی نعمانی سیرۃ النبی ج ۱ ص ۲۳)

واقدی خود تو قابل ذکر نہیں، لیکن ان کے تلامذہ خاص ہیں سے ابن سعد نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اور صحابہ کے حالات میں ایسی جامع اور مفصل کتاب لکھی کہ آج تک اس کا جواب نہ ہو سکا ۔

بالکل آخری جرح یہ ہے ۔

"ان میں سے واقدی تو بالکل نظر انداز کر دینے کے قابل ہے محدثین بالاتفاق لکھتے ہیں کہ وہ خود اپنے جی سے روایتیں گھڑتا ہے" (شبلی نعمانی ج ۱ ص ۴۸)

واقدی اپنے جی سے گھڑنے والے اور جھوٹے ہوں یا نہ ہوں لیکن حضرت شبلی نعمانی" کا جھوٹا ہونا تو بالکل عیاں ہے ۔ شبلی تو بہ رہے ان کے مکتب فکر سے وابستہ کوئی بھی شخص صبح قیامت تک یہ ثابت کرنے سے قاصر ہے کہ "محدثین نے واقدی کو بالاتفاق روایات گھڑنے والا لکھا ہو" ۔ یہ دعویٰ رجال کی کسی مستند کتاب سے ثابت کرنا محال ہے ۔ علامہ ابن حجر نے تہذیب میں امام نووی اور ذہبی سے اگر نقل کیا ہے تو صرف یہ کہ واقدی کے ضعف پر اتفاق ہے ۔ اگرچہ یہ اتفاق ہمیں تسلیم نہیں جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے پھر بھی ضعیف ہونا کہاں اور جی سے روایات گڑھنا کہاں ؟؟

امام واقدی کے بارے میں خطیب بغدادی نے تفصیل سے لکھا ہے اس کا ایک خلاصہ درج ذیل ہے ۔

"واقدی ان حضرات میں سے ہیں جن کا تذکرہ شرق وغرب میں پھیلا ہوا ہے۔ کسی تاریخ داں سے ان کی شان مخفی نہیں دور دور سے آکر لوگوں نے مختلف فنون، مغازی، سیر، طبقات، حدیث، تاریخ، فقہ، خلافیات وغیرہ میں ان کی کتابیں حاصل کیں۔ جواد، کریم، سخاوت میں مشہور تھے۔ حضرت ابوحذیفہ سے روایت ہے کہ واقدی کے پاس چھ سو بستے کتابوں کے تھے۔ لیکن خود واقدی کہتے ہیں کہ ہر شخص کی کتابیں اس کے حفظ سے زیادہ ہوتی ہیں مگر میرا حفظ میری کتابوں سے فزوں تر ہے۔

واقعات ومشاہد کی تلاش وجستجو میں ان کا یہ عالم تھا کہ خود فرماتے ہیں، میں صحابہ وشہدا کے فرزندوں یا ان کے موالی سے ملتا تو ضرور دریافت کرتا کہ آپ نے اپنے لوگوں سے فلاں معرکہ اور فلاں کی جائے شہادت کے بارے میں کچھ سنا ہو تو بتائیے، وہ بتاتے تو میں مقام شہادت کو خود جاکر دیکھتا۔ مریسیع پہنچ کر میں نے خود اس کا مشاہدہ کیا، جس معرکہ کے بارے میں بھی مجھے علم حاصل ہوتا میں جاکر اس کی جگہ کا معائنہ کرتا۔

ہارون قروی کہتے ہیں ایک بار میں نے واقدی کو ایک مشکیزہ لئے ہوئے مکہ میں دیکھ کر پوچھا کہاں کا قصد ہے؟ بتایا کہ حنین جاکر موقع اور حادثہ کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہوں۔

(ظاہر ہے کہ اس قدر تلاش وتحقیق کے ساتھ جس نے واقعات ومغازی کا علم حاصل کیا ہو وہ کسی بھی واقعہ کے بارے میں بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کرسکتا ہے مگر یہی تفصیل جو ان کے وفور علم کی دلیل تھی مؤلف سیرۃ النبی کے نزدیک دلیل کذب ہے۔ تنقید آگے آرہی ہے۔ مصباحی)

بایں ہمہ محدثین کرام امام واقدی کی جرح وتعدیل میں مختلف ہیں۔ ایک

اجمالی فہرست یہ ہے۔

امام احمد۔ امام نسائی۔ امام شافعی۔ بزار۔ ابن اسحٰق۔ علی بن مدینی۔ ابوداؤد نے انہیں دروغ گو کہا ہے۔ امام بخاری۔ ابوزرعہ۔ دولابی۔ عقیلی۔ نے متروک الحدیث کہا ہے۔ معاویہ بن صالح۔ ابن معین۔ ابن عدی نے ضعیف قرار دیا ہے۔ ساجی نے ان کی حدیث محل نظر اور اختلاف بتائی ہے۔ معن بن عیسیٰ۔ دراوردی۔ مصعب زبیری۔ ذہلی۔ مثنی۔ ابوعیسیٰ ازہری، یزید بن ہارون۔ ابوبکر صنعانی انہیں ثقہ مانتے ہیں۔ دراوردی تو امیر المومنین فی الحدیث اور ابراہیم حربی ابن الناس علی الاسلام کہتے ہیں۔ ذہلی کہتے ہیں بخدا اگر وہ میرے نزدیک ثقہ نہ ہوتے تو چار ائمہ، ابوبکر بن ابی شیبہ، ابوعبید، ابوخیثمہ (اور ایک شخص کا نام لیا) ان سے روایت نہ کرتے۔ عباس عنبری نے کہا واقدی مجھے عبدالرزاق سے زیادہ محبوب ہیں۔

حارث بن ابی اسامہ کہتے ہیں امام مالک بن انس سے اس عورت کے بارے میں جس نے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خیبر میں زہر دیا تھا پوچھا گیا کہ اس کا فیصلہ کیا ہوا۔ امام مالک نے فرمایا مجھے علم نہیں، اہل علم سے پوچھوں گا۔ انہوں نے واقدی سے ملاقات کرکے پوچھا۔ اے ابوعبداللہ! نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس عورت کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا جس نے انہیں خیبر میں زہر دیا تھا۔ امام واقدی نے کہا ہمارے نزدیک یہ ہے کہ حضور نے اسے قتل کردیا۔ امام مالک نے اپنے سائل کو باخبر کیا کہ اہل علم نے مجھے بتایا کہ سرکار نے اسے قتل کردیا۔

ابراہیم حربی فرماتے ہیں کہ امام احمد نے واقدی پر اس لئے گرفت کی ہے کہ وہ سندیں جمع کرکے سب کے متن ایک ساتھ ذکر کردیتے ہیں۔ لیکن یہ کوئی عیب نہیں ایسا تو امام زہری اور ابن اسحٰق نے بھی کیا ہے۔

شاگرد خاص ابن سعد فرماتے ہیں کہ واقدی ۱۳۰ھ میں پیدا ہوئے ۱۸۰ھ میں بغداد گئے پھر شام۔ پھر وہاں سے واپس آکر بغداد میں مقیم ہوئے۔ یہاں تک کہ

مامون نے خراسان سے آکر انہیں عہدۂ قضا سپرد کیا۔ اس وقت سے وہ برابر قاضی رہے یہاں تک کہ ذی الحجہ ۲۰۷ھ میں وفات پائی۔ (انتہی ملخصا) [1]

امام واقدی کی توثیق کرنے والوں میں ان کے شاگرد خاص محمد بن سعد کو بھی شمار کرنا ضروری ہے۔ ابن سعد کی جلالت وثقاہت مسلم ہے۔ اگر وہ واقدی کو نامعتبر اور کاذب جانتے تو ہرگز ان سے روایت نہ کرتے کیونکہ حدیث پاک میں صریح تنبیہ موجود ہے۔

کفی بالمرء کذبا ان یحدث بکل ما سمع (مسلم)

آدمی کے جھوٹا ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ جو بھی سنے بیان کردے۔

مگر یہ عجیب حیرت ہے کہ ابن سعد کی ثقاہت وجلالت تو تسلیم کی جاتی ہے مگر ان کے شیخ امام واقدی کو دروغ گو کہتے ہوئے زبان نہیں تھکتی۔

قابل توجہ یہ امر ہے کہ امام واقدی کو ثقہ ماننے والوں کی کثیر تعداد ہوتے ہوئے یہ لکھنا کتنا بڑا جھوٹ اور محدثین پر بہتان ہے کہ:۔

"محدثین" بالاتفاق" لکھتے ہیں کہ وہ خود اپنے جی سے روایتیں گڑھتا ہے"۔

جو خود ایسے جھوٹ کے مرتکب ہوں انہیں محدثین پر جرح لکھنے بلکہ نقل کرنے سے بھی شرم آنی چاہئے اور اہل علم کو تو ان حضرات کے نقل وترجمہ پر بھی بلا تحقیق وتفتیش ہرگز اعتماد نہیں کرنا چاہئے۔

اسی پر بس نہیں بلکہ ان کے کذب کی دلیل عقلی بھی تحریر فرماتے ہیں جو اہل نظر کے لئے دلچسپی سے خالی نہیں۔ فرماتے ہیں:۔

> اور حقیقت میں واقدی کی تصنیف خود اس بات کی شہادت ہے ایک ایک جزئی واقعہ کے متعلق جس قسم کی گوناگوں

[1] ابوبکر احمد خطیب بغدادی۔ تاریخ بغداد ج ۳ ص ۳ تا ۲۰ مطبع سعادت مصر ۱۳۲۹ھ

> اور دل چسپ تفصیلیں وہ بیان کرتا ہے آج کوئی بڑا سے بڑا واقعہ نگار چشم دید واقعات اس طرح قلمبند نہیں کرسکتا [1]

اس تنقید پر حضرت علامہ مفتی محمد شریف الحق صاحب امجدی کے یہ ریمارکس، قابل دید ہیں۔ لکھتے ہیں:۔

"اس مبارک متن کی شرح یہ ہے کہ مثلاً حضرت سیف اللہ خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فلاں جنگ میں فلاں پہلوان سے مقابلہ کیا جو اتنا موٹا تھا۔ اس کے پاس فلاں فلاں اسلحے تھے فلاں لباس پہنے ہوئے تھا۔ اس نے آکر پہلے یہ کہا، حضرت خالد نے اس کا یہ جواب دیا، پھر اس نے نیزہ کا وار کیا، حضرت خالد نے رد کردیا، یا پینترا بدل کر خالی دیا، اور آگے بڑھ کر اس کا نیزہ چھین لیا۔ اب اس پہلوان نے تلوار چلائی۔ حضرت خالد نے اسے سپر پر لیا۔ پھر سیف اللہ نے تلوار کا ایسا وار کیا کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا، یا وہ تلوار اس کے سر پر پڑی، خود کٹا، سر دو ٹکڑے ہوگیا، تلوار سر سے گزر کر کمر تک تیرتی ہوئی نکل گئی" (یہ صرف تمثیلاً ہے کوئی واقعہ نہیں)

علامہ کا فرمانا ہے کہ یہ تمام تفصیلات یاد کرلینا آج کے اہل حفظ وضبط کی قوت سے باہر ہے لہٰذا یہ جھوٹ اور من گھڑت ہے لیکن "قبلہ!" اس زمانے کے اہل حفظ وضبط پر اس زمان برکت نشان کے حفاظ کو قیاس کرنا ہی وہ غلطی ہے جس کے بعد کتب حدیث کا پورا ذخیرہ فرضی داستان کی صف میں آجاتا ہے۔ اس بنیادی غلطی کو دور کرنے کے لئے ہم ناظرین کو ذرا تفصیلی مطالعہ کی تکلیف دے رہے ہیں۔

امام واقدی اگر کسی جزئی واقعہ کی جملہ تفصیل بیان کریں تو وہ ان کے کذاب ووضاع ہونے کی شہادت ہے لیکن بخاری ومسلم

[1] شبلی نعمانی۔ سیرۃ النبی اول۔ ص ۴۸۔ طبع چہارم۔

میں بھی اس قسم کی تفصیلات موجود ہیں تو پھر آپ کیا فتویٰ صادر فرمائیں گے۔ اٹھائیے صحیحین اور ملاحظہ کیجئے سید الشہداء سیدنا حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کا واقعہ جس تفصیل کے ساتھ مذکور ہے کیا وہ واقدی کی بیان کردہ تفصیلات سے کسی طرح کم ہے؟ — اسی طرح آپ کی "اصح کتب بعد کتاب اللہ" میں ایک دو نہیں دسیوں جزئیات کی وہ حیرت انگیز تفصیلیں مذکور ہیں جو واقدی نے بھی نہیں بیان کیں۔ مثلاً غزوۂ بدر میں حضرت زبیر بن عوام اور ابوکرش کا مقابلہ اور اس کی پوری تفصیل کیا امام واقدی کی بیان کردہ تفصیلات سے کم ہیں؟ ابوکرش کس طرح لوہے میں غرق آیا، حضرت زبیر نے کیسے اس کی آنکھ میں برچھی ماری، اور یہ برچھی پھر کیسے نکلی، ٹیڑھی ہوئی، پھر کس کے پاس رہی، پھر کس نے کس قیمت پر خریدی؟ کیا واقدی کے یہاں کسی مجاہد کی تلوار یا برچھی کے بارے میں اتنی لمبی معلومات ہیں؟ — پھر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اگر امام بخاری جزئی جزئی باتوں کی تفصیلات بیان کریں تو وہ حفظ وضبط کے "جبل شامخ" ہوں۔ اسی کو آپ بیان کریں تو آپ کی کتاب اصح کتب ہو۔ اور امام واقدی بیان کریں تو جھوٹے، کذاب، وضاع ہوں، ان کی کتاب میں ہو تو وہ اکذب کتب ہو؟ سبحٰنک ھٰذا بھتان عظیم[1]

ستم بالائے ستم یہ ہے کہ صرف باب احکام ہی میں نہیں بلکہ باب سیر و مغازی میں بھی امام واقدی کو بخشا نہ گیا جبکہ اس باب میں وہ بلاشبہہ مقبول و مستند ہیں جس کی دلیل یہ ہے کہ تمام کتب سیر و مغازی میں ان کی روایات قبول و اعتماد کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔ تاریخ خطیب کے حوالے سے گزرا کہ امام مالک نے

[1] مفتی محمد شریف الحق امجدی، اشرف السیر نصف اول، جلد اول ص ۲۴ تا ۲۶ مطبوعہ لکھنؤ ۱۳۸۸ھ / ۱۹۶۸ء

خیبر میں زہر دینے والی عورت کا حال امام واقدی سے ہی دریافت کر کے اپنے سائل کو بتایا۔ اگر یہ ان کے نزدیک غیر معتبر ہوتے تو ہرگز ان کے قول پر اعتماد نہ فرماتے اس سے ظاہر ہے کہ امام واقدی سیر و مغازی کے باب میں امام شافعی کے استاذ امام مالک جیسے جلیل الشان ائمہ کے بھی مرجع و معتمد تھے۔ اسی لئے علامہ شمس الدین ذہبی جیسے سخت ناقد حدیث نے میزان الاعتدال میں لکھا ہے:۔

کان الی حفظہ المنتھی	ان ہی کا حفظ، اخبار سیر، مغازی
فی الاخبار والسیر والمغازی والحوادث	واقعات، تاریخ، فقہ وغیرہ میں مرجع و
وایام الناس والفقہ وغیر ذلک[1]	منتہیٰ تھا۔

جسے بھی محاورات زبان اور کلمات علما سے ادنیٰ مس ہے اس پر اس عبارت سے روشن ہے کہ ذہبی کے نزدیک بھی سیر و مغازی وغیرہ میں واقدی اپنے زمانے کے ائمہ و علما کا مرجع تھے۔ جب یہ کہا جائے کہ فلاں شخص فلاں فن میں مرجع و منتہیٰ ہے تو ہرگز اس کا یہ معنی نہیں ہو سکتا کہ اس فن میں لوگ اسے ضعیف اور غیر معتبر مانتے ہوئے محض تفریح طبع اور وقت گزاری کی خاطر اس کی جانب رجوع فرمایا کرتے ہیں۔

بہرحال ان بیانات سے ثابت ہے کہ محمد بن عمر واقدی ثقہ مستند خصوصاً سیر و مغازی کے مسلم امام ہیں ان کو "بالاتفاق جھوٹا" لکھنا تو اتنا بڑا جھوٹ ہے جس کی علمی دنیا میں کوئی مثال نہیں۔

اسی طرح انہیں بالاتفاق اور بالاجماع ضعیف بتانا بھی قطعاً یقیناً خلاف واقع ہے علامہ ابن حجر عسقلانی نے امام نووی کی شرح مہذب سے نقل کیا "ضعیف باتفاقھم" اور ذہبی کی میزان سے نقل کیا: "استقر الاجماع علی وھن الواقدی"۔ واقدی کے ضعف پر اجماع ہو چکا ہے۔

[1] ذہبی:۔ میزان الاعتدال فی نقد الرجال۔ ۳/۱۱۰۔ طبع مصر۔

اس کی تردید کے لئے خود تہذیب التہذیب اور میزان الاعتدال کا بیان کافی ہے۔ خود ذہبی لکھتے ہیں :۔

قد وثقه جماعة [1] — ایک جماعت محدثین نے ان کی توثیق کی ہے۔

اس کے بعد چند محدثین کے نام اور اقوال ذکر کئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان ثقہ، ثبت، مستند محدثین کی توثیق ہوتے ہوئے ضعف پر اجماع کا دعویٰ بر خود غلط ہے۔

درج ذیل حضرات کی توثیقیں اور ان کے کلماتِ توثیق خود ذہبی نے میزان میں ذکر کیے ہیں :۔

(۱) ابوبکر محمد بن اسحاق صغانی م ۲۷۰ھ، جو سننِ اربعہ اور امام مسلم کے رجال میں سے ثقہ، ثبت ہیں، فرماتے ہیں :

واللہ لولا أنه عندی ثقة ما حدثت عنه۔ — بخدا اگر واقدی میرے نزدیک ثقہ نہ ہوتے تو میں ان سے حدیث نہ بیان کرتا۔

(۲) معنی بن عیسیٰ قزاز م ۱۹۸ھ جنہیں ابو حاتم نے امام مالک کے تلامذہ میں سب سے زیادہ ثقہ و ثبت کہا۔ اور یہ صحاح ستہ کے رجال میں ثقہ ثبت ہیں، ان سے امام واقدی کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا " واقدی کے بارے میں مجھ سے سوال ہوتا ہے، واقدی ایسے حجت ہیں کہ ان سے میرے بارے میں پوچھنا چاہئے "

(۳) یزید بن ہارون م ۲۰۶ھ جو رجال ستہ میں ثقہ، متقن، عبادت گزار ہیں۔ انہوں نے امام واقدی کو ثقہ کہا۔

(۴) ابو عبید قاسم بن سلام م ۲۲۴ھ مشہور مصنف، فاضل ثقہ نے ان سے روایت کی اور ان کی توثیق فرمائی۔

---

[1] ذہبی شمس الدین محمد بن احمد دمشقی۔ میزان الاعتدال فی نقد الرجال۔ ج ۳ ص ۱۱۔ المطبع سعادت مصر ۱۳۲۵ھ

(۵) مصعب زبیری م ۲۳۶ھ نے انہیں ثقہ، مامون کہا۔

(۶) ابراہیم حربی م ۲۸۵ھ نے فرمایا : جو یہ کہے کہ امام مالک اور ابن ابی ذئب کے مسائل واقدی سے زیادہ ثقہ شخصیت سے حاصل کئے جا سکتے ہیں تو اس کی تصدیق نہ کرو۔ " بخدا واقدی جیسی شخصیت ہماری آنکھوں نے نہ دیکھی "۔ واقدی امین الناس علی الاسلام ہیں۔ اسلام کے حالات کا علم سب سے زیادہ واقدی کو تھا۔

(۷) دراوردی م ۱۸۶ھ یا ۱۸۷ھ جو صحاح ستہ کے رجال سے ہیں۔ انہوں نے فرمایا۔ واقدی امیر المومنین فی الحدیث ہیں۔

(۸) مجاہد بن موسیٰ م ۲۴۴ھ جو سنن اربعہ اور صحیح مسلم کے رجال سے ہیں۔ فرماتے ہیں :۔

ما كتبت عن احد احفظ من الواقدی [2] — جتنے حضرات سے میں نے حدیث نقل کی ان میں واقدی سب سے زبردست صاحبِ حفظ تھے۔

ان کے علاوہ تہذیب التہذیب میں بالفاظ تہذیب الکمال (للحافظ یوسف بن عبد الرحمٰن المزی م ۷۴۲ھ) بحوالہ تاریخ خطیب درج ذیل حضرات کا ذکر خود علامہ ابن حجر عسقلانی نے کیا ہے۔

(۹) مثنی (۱۰) ابو یحییٰ ازہری نے انہیں ثقہ مامون کہا۔

(۱۱) ابن نمیر سے ابراہیم حربی نے واقدی کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا یہاں تو ان کی حدیث دوسرے حضرات کے ہم پلہ ہے مگر اہل مدینہ کی حدیث کے وہ (مدنی ہونے کے باعث) زیادہ عالم ہیں۔ ابراہیم نے ابو عبید کی توثیق ذکر کی، اور مزید یہ بھی فرمایا کہ ابو عبید کی فقاہت امام واقدی کی کتابوں کے طفیل ہے۔

(۱۲) عباس عنبری م ۲۴۶ھ یہ رجال صحاح ستہ سے ہیں۔ امام واقدی سے روایت کرتے اور ان کی بڑی مدح و ستائش کرتے۔

(۱۳) ابو عامر عقدی م ۲۰۴ھ یا ۲۰۵ھ جو رجال صحاح ستہ سے ہیں، ان سے

امام واقدی کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا، ہم سے ان کے بارے میں پوچھا جاتا ہے ان سے ہمارے بارے میں دریافت کرنا چاہئے شائخ اور احادیث کے افادات ہمیں ان ہی سے نصیب ہوتے۔

حیرت ہے کہ ان جلیل القدر ائمہ سے امام واقدی کی توثیق اپنی ان ہی کتابوں میں درج فرمانے کے باوجود ان کے ضعف پر "اجماع واتفاق" کی بات کیسے کی جا رہی ہے۔

تاریخ خطیب میں مویدان حضرات کی جانب سے امام واقدی کی توثیق کا ذکر ہے۔

(۱۴) محمد بن احمد ذہلی م ۳۰۰ھ جو رجال نسائی میں سے ثقہ ثبت ہیں، وہ فرماتے ہیں، بخدا اگر واقدی میرے نزدیک ثقہ نہ ہوتے تو ان سے چار ائمہ روایت نہ کرتے۔

ذہلی کے راوی عبدالغنی بن سعید الحافظ ایک امام کا نام نہ بتا سکے اور ابوبکر بن ابی شیبہ، ابوعبید قاسم بن سلام، اور ابوخیثمہ کا نام ذکر کیا۔

(۱۵) ابوبکر بن ابی شیبہ م ۲۳۵ھ صاحب تصانیف ثقہ، حافظ، امام بخاری مسلم، ابوداؤد کے استاذ اور صحیحین، سنن ابی داؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ کے رجال سے ہیں۔

(۱۶) اسی طرح ابوخیثمہ زہیر بن حرب بغدادی م ۲۳۴ھ ان حضرات کے استاذ ہیں۔ امام مسلم نے ان سے ایک ہزار سے زیادہ حدیثیں روایت کیں۔ مذکورہ پانچوں کتب حدیث کے رجال سے ثقہ، ثبت ہیں۔

(۱۷) احمد بن منصور رمادی م ۲۶۵ھ جو رجال ابن ماجہ سے ثقہ ہیں وہ حدیث نبہان کا قصہ ذکر کرتے ہیں جسے امام واقدی نے امام زہری سے بروایت معمر بیان کیا تھا اور امام احمد کی اس پر گرفت یہ تھی کہ اسے زہری سے صرف یونس نے روایت کیا ہے۔ یہی حدیث احمد بن منصور کو مصر میں ابن ابی مریم نے امام زہری سے بروایت

نافع بن یزید عن عقیل سنائی تو رمادی ہنس پڑے، ابن ابی مریم نے وجہ پوچھی تو امام احمد اور واقدی کا قصہ سنایا۔ ابن ابی مریم نے کہا ہمارے شیوخ مصر کو امام زہری کی حدیثوں سے خاص اعتنا ہے۔ رمادی نے کہا:

هٰذا الحديث مما ظُلم فيه الواقدي۔ — یہ حدیث بھی ان احادیث میں سے ہے جن کے باعث واقدی پر ظلم ہوا۔

اس واقعہ کو تہذیب میں بھی نقل کیا ہے۔ اور تاریخ خطیب میں ایسے متعدد واقعات لکھے ہیں کہ واقدی پر جرحیں تو بہت سخت کی گئیں اور تفتیش کی گئی تو کوئی خاص بات ثابت نہ ہوئی۔ علی بن مدینی اور عبدالرحمٰن بن محمد کا بھی ایک مکالمہ بیان کیا ہے جس کے آخر میں عبدالرحمٰن کہتے ہیں بس اس کے سوا علی بن مدینی کچھ اور نہ کہہ سکے۔ ابراہیم حربی کے حوالے سے ایک جرح کا ذکر ابتدا میں آچکا ہے جس کے متعلق انہوں نے فرمایا کہ یہ کوئی عیب نہیں۔ ایسا تو امام زہری و ابن اسحاق نے بھی کیا ہے[1]

الغرض امام واقدی کی توثیق کرنے والے محدثین و ائمہ نے ان جرحوں کا تعاقب بھی کیا ہے جو ان کے ناقدین نے کی تھیں۔ ہم اس جرح و تعاقب کو قلم انداز کر کے ایک دوسری طرف عنان قلم موڑتے ہوئے بات ختم کرنا چاہتے ہیں۔

یہاں تک تو ان مصنفین کے حوالے تھے جو شافعی المذہب ہیں۔ اب کچھ حنفیہ کے ائمہ و علما کا فیصلہ بھی امام واقدی سے متعلق درج کیا جاتا ہے کیونکہ مؤلف سیرۃ النبی کو حنفیت کا بھی دعویٰ تھا اور اس میں تصلب ہی کی وجہ سے "نعمانی" اپنے نام کا جز بنا لیا ورنہ امام اعظم کے خاندان و نسب سے انہیں دُور کا بھی واسطہ نہیں رد غیر مقلدین میں سیرۃ النعمان نامی مستقل کتاب بھی حمایت حنفیت ہی کے پیش نظر تحریر فرمائی ہے۔

---

[1] ابوبکر احمد خطیب بغدادی: تاریخ بغداد ۳/۳ تا ۲۰ مطبع سعادت مصر ۱۳۳۹ھ۔

(۱) امام ابوجعفر احمد بن محمد طحاوی (۲۲۹ھ — ۳۲۱ھ) جنہیں علامہ علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے مجتہدین فی المسائل کے طبقے میں شمار کیا ہے اور جن کی مدح و ثنا سے کتب رجال لبریز ہیں، انہوں نے شرح معانی الآثار میں امام واقدی سے استناداً روایت کی۔

(۲) صاحب ہدایہ علی بن ابی بکر مرغینانی (م ۵۹۳ھ) جن کی جلالت شان محتاج بیان نہیں اور مذہب حنفی کے اصحاب ترجیح میں ان کا شمار ہے۔ انہوں نے امام طحاوی کی روایت پر اعتماد کرتے ہوئے بیر بضاعہ کا وہی حال لکھا جو شرح معانی الآثار میں امام واقدی کی روایت سے بیان ہوا جیسا کہ تمام شارحین نے اس کی وضاحت کی۔

(۳) امام ابن الہمام محمد بن عبدالواحد صاحب فتح القدیر (م ۸۶۱ھ) جو فقہ و حدیث کے جامع، علوم کثیرہ کے ماہر اور قریب اجتہاد کے درجہ پر فائز اور محقق علی الاطلاق تھے۔ انہوں نے امام واقدی کی توثیق ہی کو برقرار رکھا[1]

(۴) امام بدرالدین محمود بن احمد عینی (۷۶۲ھ — ۸۵۵ھ) امام ابن حجر عسقلانی کے معاصر، حدیث و فقہ کے شناور، صحیح بخاری کے شارح، بنایہ شرح ہدایہ میں امام بیہقی شافعی کی جرحیں نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

یہ امام طحاوی پر بیہقی کی جارحیت ہے۔ حیرت ہے کہ انہوں نے نے واقدی پر اس قدر تشنیع کیوں کی؟ جب کہ وہ اپنا مشاہدہ بیان کر رہے ہیں کیونکہ وہ اہل مدینہ سے ہیں اور وہاں کے عمومی احوال اور کوؤں کے احوال کا انہیں زیادہ علم بھی ہے۔ ان کے تذکرے سے روئے زمین کے مشرق و مغرب لبریز ہیں۔ آفاق عالم کے شائقین ان کے پاس آتے اور مختلف علوم و فنون میں ان کے قلم سے نکلی ہوئی کتابیں لے کر جاتے۔ جیسا کہ خطیب نے ان کے حالات میں ذکر کیا ہے۔ ابراہیم بن جابر فقیہ نے کہا: میں نے صاغانی سے سنا ہے کہ

[1] ابن الہمام۔ فتح القدیر ۱/۶۹۔ و۔ ۹۷۔

خدا کی قسم اگر واقدی میرے نزدیک ثقہ نہ ہوتے تو ان سے میں حدیث بیان نہ کرتا"۔ ان چار ائمہ نے بھی ان سے حدیث کی روایت کی ہے۔ ابوبکر بن ابی شیبہ، ابوعبید قاسم بن سلام، ابوخیثمہ اور ایک شخص"۔ ہوسکتا ہے کہ یہ امام شافعی ہوں کیوں کہ انہوں نے بھی واقدی سے روایت کی ہے (اور تہذیب میں انہیں راویان واقدی میں سرفہرست شمار کیا ہے ۱۲ مصباحی) اگر واقدی اور بقول امام طحاوی کے نزدیک ثقہ نہ ہوتے تو مقام استدلال میں ان سے وہ روایت نہ کرتے (ملخصاً مترجماً)[1]

اسی کے قریب علامہ موصوف نے عمدۃ القاری شرح بخاری میں بھی تحریر فرمایا ہے[2]

(۵) شیخ ابراہیم بن محمد حلبی (م ۹۵۶ھ) نے بھی غنیۃ المستملی میں امام واقدی کی توثیق ہی کو صحیح قرار دیا ہے[3] ان کی پوری عبارت آگے آرہی ہے:۔

(۶) علامہ زین العابدین بن نجیم مصری (م ۹۷۰ھ) نے بھی بیر بضاعہ سے متعلق امام واقدی سے امام طحاوی کی روایت کا ذکر کرکے امام بیہقی شافعی کی تنقید نقل کی ہے اور جواباً لکھا ہے۔

تلنا قد اثنی علیہ الدراوردی وابوبکر بن العربی وابن الجوزی وجماعۃ[4]	ہم کہتے ہیں دراوردی ابوبکر بن العربی ابن الجوزی اور ایک جماعت نے ان کی مدح کی ہے۔

[1] محمود عینی۔ بنایہ شرح ہدایہ ۱/۲۰۱ طبع نول کشور۔

[2] محمود عینی۔ عمدۃ القاری ۸/۴۵۹ طبع مصر۔

[3] ابراہیم حلبی۔ غنیۃ المستملی شرح منیۃ المصلی ص ۹۵۔ و ص ۱۶۹ مطبع سعادت ۱۳۲۵ھ

[4] زین بن نجیم۔ البحر الرائق شرح کنز الدقائق ۱/۸۳ طبع بیروت۔

(۷) مولانا وصی احمد محدث سورتی (۱۲۵۱ھ — ۱۳۳۶ھ) جو مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی کے مرید، مولانا احمد علی سہارنپوری محشی بخاری کے شاگرد رشید، صدر الشریعہ مولانا امجد علی اعظمی اور ابو المحامد مولانا سید محمد محدث کچھوچھوی کے استاذ جلیل تھے۔ انہوں نے بھی منیۃ المصلی کی مذکورہ شرح کبیر اور فتح القدیر کے حوالے سے امام واقدی کی توثیق ہی نقل فرمائی ہے۔ عبارتیں یہ ہیں۔

والصحیح فی الواقدی التوثیق، قال الشیخ تقی الدین بن دقیق العید فی الامام: جمع شیخی ابو الفتح الحافظ فی اول کتاب المغازی والسیر من ضعفه ومن وثقه، ورجح توثیقه، وذکر الاجوبة عما قیل فیه[1]	واقدی سے متعلق صحیح توثیق ہی ہے شیخ تقی الدین بن دقیق العید نے "امام" میں لکھا ہے کہ: ہمارے شیخ ابو الفتح حافظ نے کتاب المغازی والسیر کے شروع میں امام واقدی کی تضعیف اور توثیق کرنے والوں کا ذکر کرنے کے بعد ان کی توثیق ہی کو ترجیح دی ہے اور جرحوں کے جوابات بھی دیئے ہیں[1]

یہ الفاظ شرح کبیر کے ہیں دوسری جگہ ہے قال الحافظ ابن الہمام قال فی الامام جمع شیخنا ابو الفتح الخ[2]

(۸) امام احمد رضا قادری بریلوی قدس سرہ (۱۲۷۲ھ — ۱۳۴۰ھ) جن کی جلالت علم اور معاصرین پر علوم وفنون میں تفوق شہرۂ آفاق ہے۔ ان کے الفاظ بھی ملاحظہ ہوں:۔

"امام واقدی کو جمہور اہل اثر نے جیسں وچناں کہا جس کی تفصیل میزان وغیرہ کتب فن میں مسطور، لاجرم تقریب میں کہا: "متروك مع سعة علمه"۔ اگرچہ ہمارے علما کے نزدیک اُن کی توثیق ہی راجح ہے۔ کما افادہ المحقق فی فتح القدیر۔

بایں ہمہ یہ جرح شدید ماننے والے بھی انہیں سیر ومغازی و

[1] [2] وصی احمد محدث سورتی: التعلیق المجلی شرح منیۃ المصلی ص ۶۷ وص ۱۲۷۔ اشاعت مکتبہ قادریہ لاہور ۱۴۰۱ھ عکس طبع مطبع یوسفی لکھنؤ ۱۳۱۵ھ۔

اخبار کا امام مانتے، اور سلفاً وخلفاً ان کی روایات سیر میں ذکر کرتے ہیں۔ کما لا یخفی علی من طالع کتب القوم۔ میزان میں ہے:۔

کان الی حفظه المنتهی فی الاخبار والسیر والمغازی والحوادث وایام الناس والفقه وغیر ذلك[1]

(۹) آخر میں یہ بھی ذکر کر دوں کہ بانی تبلیغی جماعت مولوی محمد الیاس کاندھلوی کے فرزند مولوی محمد یوسف کاندھلوی سابق امیر تبلیغی جماعت نے بھی امانی الاحبار میں امام واقدی سے متعلق تفصیلی گفتگو کی ہے اور ان کی توثیق ہی کو راجح مانا ہے[2]

(۱۰) ان ہی وجوہ وحقائق کے پیش نظر فقیہ عصر، شارح بخاری مفتی محمد شریف الحق امجدی مدظلہ نے بھی ایک دیدہ ور، انصاف پسند اور جرأت مند سیرت نگار کی حیثیت سے اشرف السیر میں امام واقدی کی توثیق ہی کی تاکید فرمائی ہے۔ ان کے کچھ اقتباسات گزر چکے ہیں۔

الحاصل ان تفصیلات کی روشنی میں ناظرین پر عیاں ہے کہ امام واقدی سیر ومغازی کے تو متفق علیہ مرجع وامام تھے۔ اگر اختلاف ہے تو صرف اس میں کہ باب احکام میں ان کی روایات معتبر ہیں یا نہیں؟ اور راجح یہی ہے کہ وہ اس باب میں بھی معتبر ہیں۔ رہا یہ کہنا کہ محدثین کا ان کے "کذب" یا ان کے "ضعف" پر اجماع تھا تو یہ میزانِ نقد پر کسی طرح پورا نہیں اترتا جیسا کہ اس کی حقیقت طشت از بام ہو چکی۔ واللہ الہادی الی سواء السبیل۔

رہا یہ سوال کہ امام واقدی کی بعض روایات سے کچھ اعتراضات پیدا ہوتے ہیں تو جواباً عرض ہے کہ اعتراضات سے چھٹکارا حاصل کرنے کا یہ کوئی دیانت دارانہ اور معقول طریقہ نہیں ہے کہ ثقہ راوی کی تضعیف یا تکذیب کر کے

[1] احمد رضا قادری، فتاویٰ رضویہ دوم ص ۵۸۲ طبع اول بریلی۔
[2] محمد یوسف کاندھلوی۔ امانی الاحبار ج ۱ ص ۱۴ طبع دہلی ۱۳۷۹ھ

اس کی روایات سے نجات حاصل کی جائے صحاح ستہ کی بے شمار روایات ہیں جو حنفیہ یا شافعیہ یا دیگر اہل مذاہب کے خلاف پڑتی ہیں مگر کیا ان کے جواب کا یہی راستہ اختیار کیا گیا ہے کہ ثقہ راویوں کو جھوٹا یا ساقط الاعتبار گردان کر فرصت لے لی گئی؟ نہیں۔۔ بہت سے اصولی، علمی، معقول اور دیانتدارانہ طریقے ہیں جو اہل علم پر مخفی نہیں ع ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔

غلط تنقیدوں کے اسباب

اب ہم ان اسباب کا جائزہ لینا چاہتے ہیں جو ان مصنفین کی آفتاب نیم روز سے زیادہ نمایاں علمی خیانتوں کے اصل محرک ہیں۔ ایک سبب تو وہ ہے جس کی نشاندہی ان کے معاصر مصنفین بہت پہلے کر چکے ہیں، جس کی تفصیل یہ ہے کہ یورپین مستشرقین نے اپنے غلط اصولوں کی روشنی میں اسلام پر بہت سے اعتراضات اٹھائے ہیں جن کا جواب دینے کے لئے ضروری تھا کہ پہلے ان کے غلط اصولوں کو غلط ثابت کیا جاتا اور اسلام کے مزاج و اصول کی مدلل وضاحت کی جاتی پھر ان کے اعتراضات کا جرأت مندانہ جواب لکھا جاتا۔ اس کی واضح مثال امام احمد رضا قادری بریلوی قدس سرہٗ کا رسالہ "فوز مبین در رد حرکت زمین" ہے جس میں سب سے پہلے فلسفۂ جدید کے اصولوں پر نہایت پُر مغز اور مدلل کلام کرتے ہوئے ان کی غلطیاں واضح کی گئی ہیں۔۔ پھر مغربی ہیئت دانوں ہی کے خود ساختہ اصولوں کی روشنی میں ان کے نظریۂ حرکت کا روشن ابطال کیا گیا ہے۔ انداز بیان طریقۂ بحث و استدلال اور دلائل و شواہد میں وہ جرأت و قوت ضو فشاں ہے جو ایک اسلامی متکلم کے شایان شان ہے۔ معذرت خواہی، لجک اور احساس کمتری کا کہیں نام و نشان نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر قاری یورپین سائنسدانوں کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو تو اسے تسلیم حق میں ذرا بھی تامل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ خود مغربی ہیئت داں اگر تعصب و عناد کی عینک اتار کر نگاہِ انصاف سے دیکھے تو اس کے لئے بھی

قبولِ حق یا کم از کم سکوت کے سوا چارۂ کار نہیں۔

پھر امام احمد رضا نے مسلمانوں کی مزید تسکین خاطر کے لئے سکون زمین کی تائید میں "نزول آیات فرقان بسکون زمین و آسمان" جیسے وقیع رسالہ کی شکل میں قرآنی و اسلامی دلائل بھی پیش کر دئے ہیں، اسے کہا جاتا ہے اسلام کی صحیح وکالت۔ اور اہل باطل کا حق نما جواب۔

لیکن اس کے برخلاف نام نہاد مصنفین اپنی علمی کمزوریوں اور روح اسلام سے ناآشنائی کے باعث مستشرقین یورپ سے ہمیشہ مرعوب دکھائی دیتے ہیں۔ اور بالکل معذرت خواہی کے انداز میں جواب رقم فرماتے ہیں، حتیٰ کہ اہل باطل کے غلط پیمانوں کو توڑنے کے بجائے خود اپنے پیمانے بدلتے اور توڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عیسائیوں نے بحیرا راہب کے واقعہ سے متعلق ایک اعتراض کر دیا تو ان حضرات نے اس واقعہ پر مشتمل حدیث اور اس کے راویوں کی دھجیاں بکھیرنا اپنا فرض اولیں سمجھا۔ یہ بھی خیال نہ آیا کہ ان مستند راویوں کو ساقط الاعتبار قرار دینے کا انجام کہیں یہ تو نہیں کہ خود بخاری و مسلم اور بقیہ صحاح ستہ ہی کا کوئی وزن نہ رہ جائے۔ کیونکہ ان ہی راویوں سے ان مستند کتابوں میں بے شمار احادیث موجود ہیں۔ جب مسلمانوں کی سب سے زیادہ معتبر کتب حدیث اور ان کے مذہب کی ایک بنیاد ہی ساقط الاعتبار ہو جائے تو ان کے مذہب کا کیا وقار باقی رہے گا گویا ان پر مستشرقین کے اعتراضات سن کر ایسی بدحواسی طاری ہو جاتی ہے کہ جواب دیتے ہوئے یہ بھی ہوش نہیں رہتا کہ یہ جواب اسلام کے لئے کہیں ان کے اعتراض سے زیادہ مضر تو نہیں؟۔۔ واقعہ بحیرا پر سیرۃ النبی کی جلدیں اور ان کا رد ہم نے بالتفصیل تحریر کیا ہے آپ ذرا ورق الٹ کر دیکھیں کہ عیسائیوں کا اعتراض زیادہ مضر ہو سکتا تھا یا ان سیرت نگاروں کا جواب انتہائی خطرناک اور مضر ہے۔

اسی طرح بے شمار مقامات میں یہ حضرات اسی حرکت مذبوحی کا ارتکاب کرتے چلے جاتے ہیں اور بزعم خویش یہ اثر دیتے ہیں کہ ہم نے اسلام کی بڑی

خدمت انجام دی اور اس کی وکالت کا صحیح حق ادا کر دیا یہ سب کچھ مرعوبیت اور اسلامی علوم و فنون میں قلت مہارت کی دلیل ہے ورنہ مخالفین اسلام کا اعتراض کوئی نئی چیز نہیں علمائے اسلام ابتدا ہی سے اہل باطل کا مقابلہ کرتے چلے آئے ہیں۔ لیکن جب بھی ان کا روئے سخن اہل باطل کے مقابل ہوتا ہے تو ان کے کلام میں وہی قوت و سطوت ہوتی ہے جو اسلام کے بے داغ چہرے کو روشن و تابناک ہی دکھا کر چھوڑتی ہے۔ دور کیوں جائیے امام احمد رضا بریلوی ہی کا دوسرا رسالہ "الصمصام علی مشکک فی آیۃ علوم الارحام" دیکھئے جو اسلام پر کسی پادری کے ایک اعتراض کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ ابتدا تا انتہا جرأت ہی جرأت اور قوت ہی قوت ہے۔ دیکھنے سے صحیح اندازہ ہو سکتا ہے کہ ایک مسلمان کو غیر مسلموں کا جواب (خواہ وہ کتنے ہی تعلیم یافتہ کیوں نہ ہوں) کس متانت و قوت، اور جرأت و شوکت سے دینا چاہئے حیرت ہے کہ اہل باطل اسلام ناشناسی، غلط فہمی، کوتاہ بینی، اور کم علمی کے باوجود بے سروپا فضول اعتراضات کے لئے تو وہ زبان و بیان اختیار کریں جو نام نہاد علما کو حیرت و مرعوبیت میں ڈال دے اور ان کا جواب دینے کے لئے اسلام کا وکیل، اسلام کی حقانیت، اس کے نظریات کی قوت اور مشاہدات و واقعات کی صحت و اصلیت کے باوجود معذرت خواہانہ رویہ اختیار کر کے خود اسلام ہی کی شوکت دلوں سے گھٹانے کا کارنامہ سرانجام دے۔ ایسی وکالت سے تو وہ مخالفت ہی اچھی تھی کہ مخالف کے پروپیگنڈے کا ہرگز وہ اثر نہیں ہو سکتا جو موافق کی معذرت خواہی یا بلفظ دیگر اس کی جانب سے ایک ناکردہ جرم کے اقبال کا ہو سکتا ہے۔

مولوی محمد ادریس کاندھلوی، شبلی نعمانی اور ان کے ہمنواؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کی تین خصوصیتیں ذکر کرتے ہیں :-

(۱) اس دور میں اگرچہ سیرت نبوی پر چھوٹی اور بڑی بہت سی کتابیں لکھی گئیں اور لکھی جا رہی ہیں لیکن ان کے مؤلفین اور مصنفین زیادہ تر فلسفۂ جدیدہ

اور یورپ کے فلاسفروں سے اس قدر مرعوب اور خوف زدہ ہیں کہ یہ چاہتے ہیں کہ آیات و احادیث کو توڑ مروڑ کر کسی طرح فلسفہ اور سائنس کے مطابق کر دیں۔

(۲) یہی وجہ ہے کہ جب معجزات اور کرامات کا ذکر آتا ہے تو جس قدر ممکن ہوتا ہے اس کو ہلکا کر کے بیان کیا جاتا ہے اگر کہیں راویوں پر بس چلتا ہے تو جرح و تعدیل کے ذریعہ سے محدثانہ رنگ میں ان روایات کو ناقابل اعتبار بنانے کی کوشش کی جاتی ہے اور اسماء الرجال کی کتابوں سے جرح تو نقل کر دیتے ہیں اور توثیق و تعدیل کے اقوال نقل نہیں کرتے جو سراسر امانت اور دیانت کے خلاف اور قرآن میں تبدونها و تخفون کثیرا کا مصداق ہے اور جہاں راویوں پر بس نہیں چلتا وہاں صوفیانہ اور محققانہ رنگ میں آکر تاویل کی راہ اختیار کی جاتی ہے جس سے آیت اور حدیث کا مفہوم ہی بدل جاتا ہے۔

(۳) اور جب خداوند ذوالجلال کے باغیوں سے جہاد و قتال کا ذکر آتا ہے تو بہت پیچ و تاب کھاتے ہیں اور اس کو اسلام کے چہرے پر ایک بدنما داغ سمجھ کر دھونے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ تو ممکن نہ ہوا کہ اعداء اللہ سے جہاد و قتال کی آیات و احادیث کا انکار کر سکیں، اس لئے تاویل کی راہ اختیار کی کہ یہ غزوات و سرایا اعلاء کلمۃ اللہ یعنی اللہ کا بول بالا کرنے اور آسمانی بادشاہت قائم کرنے اور قانون خداوندی کو علی الاعلان جاری کرنے کے لئے نہ تھے۔ بلکہ محض اپنی حفاظت اور جان بچانے اور دشمنوں کی مدافعت کے لئے تھے۔ (سیرت مصطفےٰ از محمد ادریس کاندھلوی، مطبوعہ مکہ پبلشنگ کمپنی لاہور ج ۱ ص ۱۵) [1]

دوسرا سبب :- لیکن میرے نزدیک ان مذبوحی حرکات کے پردے میں ایک اور محرک چھپا ہوا ہے۔ وہ ہے جذبۂ "انا" کی تسکین۔ اور عام قارئین پر یہ اثر ڈالنا کہ تحقیق و تصنیف کا حق صرف ہم نے ادا کیا۔ ماضی کے بڑے بڑے علما

[1] بحوالہ مولانا شرف قادری۔ حرف آغاز۔ غزوات النبی از مولانا نور بخش توکلی ص ۴۔۵ مطبوعہ لاہور ۱۴۰۱ھ ۱۹۸۱ء

غلطیوں اور نا فہمیوں کی دلدل میں پھنسے ہوتے تھے۔ یہ ایک نفسیاتی طریقہ ہے کہ اکابر اور مشہور و معتبر لوگوں پر تنقید کرو۔ لوگ تم سے مرعوب و متاثر ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ جدید مصنفین اکابر اسلام کی نہایت تیز و تلخ تنقید و تنقیص کرتے ہیں اور پوری قوتِ ذہن و قلم ان کو مجرم و خطا کار ٹھہرانے میں صرف کر دیتے ہیں۔ عجب تماشا ہے کہ ایک طرف مستشرقین سے خوفزدہ و مرعوب جن کے جواب میں معذرت خواہی کے سوا انہیں کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ دوسری طرف اجلہ علمائے اسلام کی بارگاہوں میں جری و بہادر جن کو بہر نوع کم سواد اور بے احتیاط ثابت کرنا ہی فرض اوّلین سمجھتے ہیں۔ اپنی کم علمی و کوتاہ نظری کے باعث غیر مسلموں کا جواب نہیں دے پاتے تو علمائے اسلام پر غصہ اتارتے ہیں اب ظاہر ہے کہ ان کے حق کو ناحق باور کرانا آسانی سے نہیں ہو سکتا۔ اس لئے یہاں ان کا شورِ قلم دیدنی ہوتا ہے ساتھ ہی نقد منفعت یہ بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ عام مسلمان چاہے سارے اکابر اسلام سے بدظن ہو جائیں ہم سے مرعوب اور ہمارے معتقد تو ہو جائیں گے۔!! طمعِ نام و نمود اور ہوسِ شہرت و اقتدار کی دنیا میں اس سے بڑی دولت کیا ہو گی؟؟ ع

فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست

تیسرا سبب

معجزات کے باب میں تیسرا اور خاص اہم سبب ہے ان مصنفین کی رسول دشمنی اور بارگاہ نبوت و رسالت میں تنقیص کا جذبہ فراواں!۔۔۔ یہی جذبہ انہیں ایسے اصول و قواعد اختراع کرنے پر مجبور کرتا ہے جن کا قدمائے اسلام میں کہیں نام و نشان نہیں۔ تمام جمہور اسلام کا اس بات پر اجماع ہے کہ باب فضائل میں ضعیف حدیث بھی کافی ہے۔۔۔ ہاں احکام کے لئے صحیح لذاتہ صحیح لغیرہ، حسن لذاتہ یا کم از کم حسن لغیرہ ہونا ضروری ہے۔ اور اصول عقائد کے لئے اس سے بھی قوی قطعی دلیل درکار ہے۔ لیکن یہ حضرات تاریخ و سیر میں بھی احکام جیسی احادیث ہونے پر مصر ہیں۔ اگرچہ خود اس پر عامل نہیں۔ کتنے مقامات ہیں جن میں صحیح احادیث کے بغیر انہوں نے واقعات کو تسلیم کر لیا ہے لیکن خاص

طور سے جب فضائل سرورِ کائنات علیہ الصلوات والتحیات اور معجزات کا باب آتا ہے تو ان کی نگاہِ جرح و تنقید تیز سے تیز تر ہو جاتی ہے یہاں تک کہ حسن بلکہ صحیح حدیثیں بھی ضعیف بلکہ موضوع نظر آنے لگتی ہیں۔

معجزات کے امکان و وقوع اور انبیائے کرام سے ان کے صدور کی حقیقت و اصلیت ثابت کرنے اور تسلیم کرنے کے باوجود چند اہم معجزات کا ذکر کرتے ہیں جو اس قدر قوی روایات سے وارد ہیں کہ رد و انکار کی گنجائش نہیں۔ اگرچہ انہیں بھی ہلکے پھلکے انداز سے لکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہنا یہ ہے کہ جہاں مستشرقین کا خطرہ نہیں (اور اگر بعض اعتراضات کا خطرہ ہے تو ان کے جوابات بھی ہو چکے ہیں) آخر وہاں ردِّ معجزات کا سبب کیا ہے؟ یہ بھی نہیں کہ صرف اُن ہی معجزات کو رد کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے جو ضعیف سندوں سے مروی ہیں۔۔۔ بلکہ صحیح و حسن روایات کو رد کرنے پر بھی کمرِ ہمت باندھ رکھی ہے یہاں تک کہ بھیڑیئے کے کلام کرنے کی حدیث صحیح سے متعلق کمالِ خیانت کا ثبوت دیتے ہوئے لکھ دیا "لیکن امام بخاری فرماتے ہیں اس کی سند قوی نہیں" تفصیل گزر چکی۔ وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

خصائص رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کا باب آتا ہے تو دیکھتے ہیں کہ علمائے اسلام نے خصائص سرورِ کائنات علیہ الصلوات والتحیات کے ذکر جمیل سے ضخیم ضخیم جلدیں فردوس قلب و نظر بنا رکھی ہیں، یہ منظر نقص جو طبائع پر ایسا گراں گزرتا ہے کہ ارباب سیر پر اس طرح غصہ اتارتے ہیں۔

> انہوں نے معمولی معمولی سی باتوں کو خصوصیات میں شمار کر کے خصائص نبوی کا ایک بڑا "انبار" لگا دیا ہے۔ مثلاً حافظ ابو سعید نیشاپوری نے شرف المصطفےٰ میں آپ کے خصائص کی تعداد ساٹھ لکھی ہے (یہی ضرورت سے زیادہ اور برداشت سے باہر تھی)۔ مصباحی ۱۲ اگر حافظ سیوطی نے خصائص کبریٰ میں اس پر سیکڑوں کا

اور اضافہ کیا ہے (جسے ساری دنیا نگاہِ استحسان سے دیکھے مگر ہمارے اوپر ستم بالائے ستم ہے۔۱۲) ـــــ حالانکہ ان میں اکثر کا ماخذ تاویلِ بعید، نکتہ آفرینی، اور ضعیف روایتیں ہیں۔[1]

علامہ سیوطی نے کب دعویٰ کیا کہ یہ خصائص باب عقائد و احکام سے ہیں کہ ان پر صرف صحاح و حسان کی پابندی فرض ہے۔

ایک طویل تقریر کے بعد رقمطراز ہیں :۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جو خصائص ذاتی ہیں، وہ چند محدود امور ہیں اور کتاب و سنت نے ان کا مخصوص ہونا عام آشکار کر دیا ہے۔ (ص ۸۳۳)

مجھے صرف یہ دکھانا ہے کہ سید المرسلین علیہ افضل الصلوٰۃ واکرم التسلیم کے خصائص و فضائل کی کثرت سے یہ کس قدر چراغ پا ہو رہے ہیں اور بالکل چیں بجبیں دکھائی دیتے ہیں۔ یہی تصویر ذیل کے جملوں میں دیکھئے۔

(خصائص نبوی)۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی چھ باتیں گنائی ہیں۔ احادیث کی دیگر روایتوں میں بعض اور خصائص بھی زبان اقدس سے بیان ہوئے ہیں ..... مگر حقیقت میں ان میں بعض جزئیات ایسی ہیں جو ان ہی چھ عنوانوں کے تحت میں کسی نہ کسی حیثیت سے مندرج ہیں۔ (ص ۸۴۲)

ان حضرات کے مذہب کی الہامی کتاب ہے تقویت الایمان از مولوی اسماعیل دہلوی اس میں تحریر فرماتے ہیں :۔

کسی بزرگ کی شان میں سنبھال کر بولو اور جو بشر کی سی تعریف ہو سو ہی کرو سو اس میں بھی اختصار کرو (ص ۵۵۔ شائع کردہ راشد کمپنی دیوبند۔ محمدی پرنٹنگ پریس دیوبند)

[1] سلیمان ندوی۔ سیرۃ النبی سوم ص ۸۳۳۔

ایک آڈر تو یہ ہے کہ بشر ہی کی سی تعریف کرو۔ دوسرا حکم یہ ہے کہ ان میں بھی اختصار ہی کرو۔ یعنی بشر سی تعریف کر دو بھی تو معمولی ہلکے پھلکے مختصر طور سے ابتدائیں نے یہ عبارت دیکھی تو مجھے حیرت تھی کہ جو تعریف واقعی اور دلائل قویہ سے واضح و روشن ہو اس میں اختصار و کمی کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے، لیکن مصنفِ تقویت الایمان کے روحانی فرزندوں نے عملی طور پر یہ مسئلہ سمجھا دیا کہ واقعی تعریفات میں کمی اور اختصار کا طریقہ کیا ہے مثلاً (۱) اگرچہ یہ تمام علمائے اسلام بالاتفاق مانتے آئے ہیں کہ فضائل سرور کائنات علیہ الصلوات والتحیات میں ضعیف حدیثیں بھی کافی ہیں کیونکہ ان کی شان "بعد از خدا بزرگ توئی" ہے تو جو بھی فضائل و کمالات بعطائے الٰہی کسی انسان میں ممکن ہیں یقیناً رب کریم نے بلا بخل و مانع اپنے محبوب عالی صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دئے ہیں۔ نگاہ ایمان میں یہی دلیل کافی ہے۔ اب اگر کوئی ضعیف حدیث بھی مل جاتی ہے تو یہ مزید تسکین و تقویت کا سبب ہے۔

لیکن ان حضرات نے اختصار کا سب سے پہلا اصول یہ وضع کیا کہ فضائل و معجزات کے لئے بھی اعلیٰ درجہ کی سند اور نہایت طاقت ور روایت ہونا ضروری ہے۔ اب یہ اصول مسلمانوں کی نظر میں صدیوں کے راسخ اصول سے متصادم ہونے کے باعث "سراپا بدعت" اور بالکل بے گانہ و اجنبی تھا جس سے ان کی روح ایمانی کا متنفر ہونا فطری امر ہے۔ اس لئے اس کو دل کش پیرایہ میں ڈھالنے کی سعی دلفریب فرمائی :۔

عشق نبوی نے فضائل و مناقب کی کثرت کے شوق میں ہر قسم کی روایتوں کے قبول کرنے پر ان کو آمادہ کر دیا حالانکہ خود اسی جذبۂ عشق اور اسی ولولۂ شوق نے ثقات محدثین اور علم حدیث کے اکابر کو روایتوں کے نقد و بحث میں اس قدر سخت گیر بنا دیا کہ وہ ایک لفظ بھی تحقیق اور کاوش کے بغیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنا گناہِ عظیم سمجھتے تھے۔ (د ۲۴۷ ج ۲)

کس قدر ابلہ فریبی ہے، روایتوں کے نقد و بحث میں الخ۔ سیدھے یہ نہیں کہتے کہ ثقات محدثین باب فضائل میں بھی حدیث صحیح ہونا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ ایسا نہیں۔ ثقات محدثین اور اکابر جرح و تعدیل بھی باب فضائل میں اسی ولولہ شوق اور جذبۂ عشق نبوی کے حامل ہیں جو انہیں ضعاف کو بھی قبول کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ اس لئے ثابت کچھ کرنا ہے، دعویٰ کچھ ہے دلیل کچھ دی جارہی ہے کون نہیں جانتا کہ تمام محدثین و فقہائے کرام روایتوں کے نقد میں سخت تھے مگر ضعیف کو ضعیف ہی کہتے۔ موضوع کو موضوع ہی گردانتے۔ لیکن یہ سب کچھ کرنے کے باوجود اپنی ہی نقد کردہ ضعیف کو باب فضائل میں معتبر بھی قرار دیتے۔ ہاں موضوع کو کسی بزرگ کے یہاں کسی باب میں باریابی نہ تھی نہ ہے۔ اور احکام میں ضعیف کا بھی گزر نہیں۔

رسول کی تعریف میں اختصار کا کیسا آسان طریقہ وضع کیا، سیکڑوں فضائل جو سیکڑوں احادیث میں وارد ہوئے اور علمائے اسلام صدیوں سے انہیں لکھتے، بیان کرتے اور مانتے چلے آئے سب سے یکلخت انکار کی راہ نکل آئی اور حسب منشا اختصار کا ایک اہم باب کھل پڑا۔ اس سے بھی جی نہ بھرا تو صحیح و حسن احادیث کو رد کرنے پر بھی کمر ہمت باندھی جس کے لئے یہ طرز وضع کیا۔

کہ راویانِ حدیث کو نکالو اور رجال کی کتابیں کھول کر ان پر جتنی جرحیں ملتی جائیں سب نقل کرتے جاؤ اور تعریف و توثیق والی عبارتوں اور ناقدین کے قولِ فیصل، محدثین کے اعتبار و قبول سب سے آنکھیں بند کرکے یک طرفہ حکم لکھو کہ جو راوی اتنے عیوب و نقائص کا مجسمہ ہو اس کی حدیث کس پایہ کی ہوگی۔ نتیجۃً وہ بھی ساقط الاعتبار ٹھہری۔

تفصیل کے لئے دیکھئے واقعہ بحیرا اور واقعۂ گرگ پر تنقیدات کا محاسبہ۔

اس سے بھی سیری نہ ہوئی کہ ہم نے کون سا کمال کیا اور اپنے روحانی باپ

مؤلف تقویت الایمان کی کیا بڑی اطاعت کرلی ضعیف کو ضعیف یا حسن و صحیح کو ضعیف بنالینا ہمارے جوش و ہمت کے آگے کوئی وزن نہیں رکھتا۔ کچھ معتبر احادیث کو موضوع بھی لکھنا چاہئے اس کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ۔

بعض محدثین کو جو بعض حضرات کے نزدیک باب احکام و عقائد میں معتبر نہ تھے مثلاً امام المغازی محمد بن عمر واقدی علیہ الرحمہ ان کو لکھو کہ "بالاتفاق جھوٹا" تھا۔ خوبی یہ کہ ایسے امام کو واضع و کذاب بنایا جن سے فضائل و سیر کی کثیر روایات مروی تھیں اور جن کے بارے میں علامہ ذہبی جیسے سخت ناقد حدیث نے فرمایا تھا۔

کان الی حفظہ المنتھی فی الاخبار والسیر والمغازی والحوادث وایام الناس والفقہ وغیر ذلک۔ اخبار، سیر، مغازی، واقعات و تاریخ اور فقہ میں ان ہی کے حفظ پر انتہا ہے۔

اگر کسی قلیل الروایۃ امام کو "جھوٹا" بناتے تو اختصارِ تعریف کا زیادہ موقع فراہم نہ ہوتا نہ زیادہ روایات کو موضوع بنانے کے جوش و ہمت کو تسکین ہوتی۔ اس لئے امام واقدی کو منتخب کیا اور ان کے انتخاب میں آسانی بھی تھی کیونکہ ان کی جرح میں بعض اقوال سخت بھی تھے اور ان سے ان کے شاگرد محمد بن سعد (جن کو یہ جدید مصنفین بھی ثقہ و معتبر ماننے پر مجبور ہیں) نے طبقات کی بیشتر روایات لے لی ہیں خود شبلی نعمانی فرماتے ہیں کہ:۔

طبقات کی نصف روایات واقدی سے مروی ہیں۔

مقصود اصلی نقد حاصل ہے۔ آدھی روایاتِ طبقات ابن سعد بآسانی موضوع ہوگئیں، علاوہ طبقات کے اور محدثین کی کتابوں میں جن جن روایاتِ فضائل میں امام واقدی کا نام آگیا وہ مزید برآں ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں جاکر ان کے جذبۂ تنقیص فضائل کو قدرے تسکین حاصل ہوئی۔

یہ تو چند نمایاں طریقے تھے جو میں نے بیان کر دئے جزئی چابک دستیاں ان پر فزوں ہیں۔

اب کتاب "تقویۃ الایمان" کی چند تعلیمات بھی ملاحظہ فرمائیے پھر اس کے ساتھ ان حضرات کی شیفتگی اور تعلق خاطر کا جائزہ لیجئے۔

(۱) جیسا کہ ہر قوم کا چودھری اور گاؤں کا زمیندار ہوتا ہے سو ان معنوں کر ہر پیغمبر اپنی امت کا سردار ہے۔ (ص ۵۵ سطر ۹ — ۱۰)

(۲) جتنے اللہ کے مقرب بندے ہیں وہ سب انسان ہی ہیں اور بندے عاجز اور ہمارے بھائی مگر اللہ نے ان کو بڑائی دی وہ بڑے بھائی ہوئے ہم کو ان کی فرمانبرداری کا حکم ہے۔ ہم ان کے چھوٹے ہیں۔ (ص ۵۲)

(۳) سب انبیاء اور اولیاء اس کے روبرو "ایک ذرۂ ناچیز سے بھی کمتر" ہیں۔ (ص ۴۸)

(۴) یہ یقین جان لینا چاہئے کہ ہر مخلوق بڑا ہو یا چھوٹا وہ اللہ کی شان کے آگے "چمار سے بھی" ذلیل ہے۔ (ص ۱۳)

(۵) کسی انبیاء و اولیاء یا امام یا شہید کی جناب میں ہرگز یہ عقیدہ نہ رکھے کہ وہ غیب کی بات جانتے ہیں بلکہ حضرت پیغمبر کی جناب میں بھی یہ عقیدہ نہ رکھے اور نہ ان کی تعریف میں ایسی بات کہے۔ (ص ۲۳)

(۶) اللہ صاحب نے کسی کو عالم میں تصرف کرنے کی قدرت "نہیں دی" اور کوئی کسی کی حمایت نہیں کر سکتا۔ (ص ۷) — وہ ایک ایک میں آپ ہی تصرف کرتا ہے" اور کسی کو کسی کے قابو میں نہیں دیتا" — (ص ۸)

(۷) یہ بات خود غلط ہے کہ کسی کو کچھ حاجت برلانے کی طاقت ہووے۔ (ص ۱۷)

(۸) جس کی توحید کامل ہے اس کا گناہ وہ کام کرتا ہے کہ اوروں کی عبادت وہ کام نہیں کر سکتی" فاسق موحد ہزار درجہ بہتر ہے متقی مشرک سے"۔ (ص ۱۷)

ان عبارتوں میں :—

(۱) نبی کو گاؤں کے زمیندار اور چودھری کی طرح قرار دیا گیا ہے۔

(۲) تمام انبیا اور رسولوں کو بڑا بھائی اور اپنے کو چھوٹا بھائی کہا گیا ہے۔ یعنی باپ کے برابر بھی درجہ دینے کو تیار نہیں۔

(۳) رب کریم انبیا کو معزز اپنی بارگاہ میں صاحب مرتبہ اور ذی وجاہت بتایا ہے۔ مگر اس کتاب میں "ذرۂ ناچیز سے بھی کمتر" کہا گیا ہے۔

(۴) چمار سے بھی زیادہ ذلیل ٹھہرایا ہے۔

(۵) انبیا کے غیب داں ہونے سے انکار کیا ہے جب کہ نبی کا معنی ہی ہے "غیب کی خبر دینے والا" غیب جانے بغیر غیب بتانا محال ہے۔

(۶) قرآن فرماتا ہے "النبی اولیٰ بالمومنین من انفسہم" نبی مسلمانوں کے ان کی جانوں سے بھی زیادہ مالک ہیں مگر اس کتاب میں اس کا کھلا ہوا انکار ہے۔

(۷) مشاہدات سے ثابت ہے کہ بہت سے لوگ دوسروں کی حاجتیں پوری کرتے ہیں حدیث میں بھی اس کی ترغیب دی گئی ہے من کان فی حاجۃ اخیہ کان اللہ فی حاجتہ۔ جو اپنے بھائی کی حاجت برلائے خدا اس کی حاجت پوری کرے گا۔ مگر اس کتاب میں انبیا و اولیا کے اندر کسی طرح کی کوئی حاجت برلانے کی قوت ہونے سے صریح انکار موجود ہے۔

(۸) متقی اور مشرک دونوں وصف ایک شخص میں جمع کیے ہیں یعنی مشرک ہونے کے بعد بھی تقویٰ برقرار رہتا ہے اور توحید کامل کر کے پھر ہزار گناہ کرے کوئی نقصان نہیں بلکہ فائدہ ہی فائدہ ہے اتنا فائدہ جو اوروں کی عبادت میں نہیں۔

آپ نگاہِ ایمان اور چشمِ تصور وا کر کے فیصلہ کریں کہ اس کتاب نے انبیا اور اولیا اور خود سید الانبیاء علیہ وعلیہم السلام کے بارے میں کس

اہانت آمیز فکر و مزاج کی رہنمائی کی ہے ۔ یہ تو صرف نمونہ ہے، پوری کتاب توحید کے نام پر نبوت و رسالت کی توہین کے لئے تحریر کی گئی ہے ۔

علمائے اسلام ہمیشہ نہایت سرگرمی کے ساتھ توحید کی دعوت دیتے اور کفر و شرک کی مذمت کرتے رہے ہیں لیکن ساتھ ہی انہوں نے تعظیم رسالت کی بھی دعوت دی ہے اور دعوت توحید یا رد شرک کے لئے انہیں بارگاہِ رسالت میں ہرگز کوئی اہانت آمیز کلمہ لکھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی ۔

تقویت الایمان جیسی دعوت توحید کا نام و نشان ثقات اسلام اور علمائے اکابر کی کسی تحریر میں نہیں مل سکتا، اس کا رشتہ ناطہ ملتا ہے تو خوارج سے جنہوں نے اِنِ الحکمُ الا اللہ (حکم نہیں مگر اللہ کا) کہہ کر حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کو کافر و مشرک کہہ ڈالا۔ کیونکہ انہوں نے جنگ میں انسان کو حَکم بنانا تسلیم کر لیا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے لا یعلم الغیب الا ھو۔ پیش کر کے تقویت الایمان ہر اس شخص کو مشرک کہتی ہے جو اولیا و انبیا یا سید الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے غیب کا علم مانتا ہو۔ اگرچہ اس کا عقیدہ یہ ہو کہ یہ علم ان کو خدا کے دینے سے حاصل ہے۔

یہ کتاب تیرہویں صدی میں لکھی گئی اور اس نے انبیاء و اولیا کی بارگاہوں میں اہانت و گستاخی کا ایک خاص مزاج پیدا کیا جو اس کے متبعین میں ترقی پذیر ہو کر مزید کھلی ہوئی گستاخیوں کا باعث بنا مگر ان سب کے باوجود اس کتاب کا مرتبہ و مقام اس طبقہ کے نزدیک قرآن سے بلند و بالا نظر آتا ہے۔

ملاحظہ ہو۔

اس (تقویت الایمان) کا رکھنا اور پڑھنا اور عمل کرنا عین اسلام اور موجب اجر کا ہے۔

(فتاویٰ رشیدیہ سوم ص ۵۰)

عین اسلام کے لئے قرآن کا تو صرف ماننا کافی ہے۔ اگر کسی نے اسے رکھا اور پڑھا نہیں مگر پورے طور پر مانتا ہے تو وہ مسلم ہے مگر تقویت الایمان ایسا عین اسلام ہے کہ اس کا صرف ماننا بھی کافی نہیں بلکہ رکھنا، پڑھنا، اور عمل کرنا تینوں ہی ضروری ہے۔ اس اہانت آموز کتاب کو جو درجہ دیا گیا ہے وہ مذکورۂ بالا کتاب کے الفاظ سے بخوبی ظاہر ہے۔

سیرۃ النبی کے مؤلف سید سلیمان ندوی کو تقویت الایمان سے کس قدر دل چسپی تھی اور اس کا دیا ہوا مزاج ان کے خمیر میں کس طرح رچ بس گیا تھا، یہ خود اُن ہی کے الفاظ میں سُنئے:۔

"قرآن پاک کے بعد مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تقویت الایمان میرے ہاتھ میں دین کی پہلی کتاب دی گئی ۔ میں ان بی بیوں کے بیچ میں بیٹھ کر تقویت الایمان کا ایک ایک باب پڑھتا تھا اور بھائی صاحب مرحوم پردے کے پیچھے اس کے ایک ایک مسئلہ کی تشریح و تفسیر فرماتے تھے۔ اور وہ جو کچھ فرماتے وہ میرے دل میں بیٹھتا جاتا۔

یہ پہلی کتاب تھی جس نے مجھے دین حق کی باتیں سکھائیں اور ایسی سکھائیں کہ اثنائے تعلیم و مطالعہ میں بیسیوں آندھیاں آئیں، کتنی دفعہ خیالات کے طوفان اٹھے مگر اُس وقت جو باتیں جڑ پکڑ چکی تھیں ان میں سے ایک بھی اپنی جگہ سے ہل نہ سکی۔"

(حیات سلیمان از شاہ معین الدین ندوی ص ۶۷، طبع ۱۴۰۱ھ ۱۹۸۰ء)

سب سے پہلے تقویت الایمان پڑھائی، اس کا ایک ایک مسئلہ دل میں گھر کر گیا، بیسیوں آندھیاں آئیں مگر تقویت الایمان کی ایک بات بھی جو دل میں جڑ پکڑ چکی تھی، اپنی جگہ سے ہل نہ سکی، یہ جملے خاص

طور سے یاد رکھنے کے ہیں. تقویت الایمان کی ان ہی تعلیمات میں سے یہ بھی ہے کہ "جو بشر کی سی تعریف ہو سو ہی کرو، سو اس میں بھی اختصار کرو". اس فکر و مزاج کا حامل کوئی شخص جب سیرت نبوی لکھنے بیٹھے گا تو ضرور اس کے پیش نظر یہی عقیدہ ہوگا کہ نبی کی تعریف و توصیف بشر کی سی ہو بلکہ اس میں بھی اختصار اور کمی ہو۔

گزشتہ اوراق میں دی ہوئی مثالیں اس پر شاہد عدل ہیں ـــــ کہ تقویت الایمان کی اس تعلیم پر ان حضرات نے پورے طور سے عمل کر کے دکھادیا اور جو قرار واقعی تعریف ہونی چاہئے تھی وہ بھی نہ کر سکے بلکہ اس میں بھی اختصار اور کمی کے بہت سے دروازے کھول لئے ـــ اور سلیمان ندوی صاحب کے اندر تو یہ مزاج اس قدر راسخ ہوا کہ انہیں بیعت و ارادت کے لئے ایک ایسی شخصیت پسند آئی جو نہ صرف یہ کہ تقویت الایمان پر کامل ایمان رکھتی تھی بلکہ مزید ترقی کر کے ایسی سخت گستاخانہ عبارت اپنی کتاب حفظ الایمان میں رقم کر چکی تھی جس کی کوئی تاویل ہزار کوششوں کے باوجود آج تک نہ ہو سکی. یہ عبارت وہ ہے جس میں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لئے کل علم غیب کا حصول عقلاً نقلاً باطل کہا گیا ہے اور بعض علم غیب کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ اگر انہیں حاصل ہو تو اس میں ان ہی کی کیا تخصیص ہے. ایسا تو ہر زید و عمر، بلکہ ہر بچے، دیوانے بلکہ ہر جانور (بیل، گدھے، سور، کتے) کو حاصل ہے ـــ سرکار کے علم غیب کی دو قسمیں کی گئیں، کل یا بعض، کل کو عقلاً نقلاً باطل کہا. بعض کو ہر رذیل سے رذیل کے لئے حاصل کہا اور اس بعض کو ان رذیل چیزوں کے علم کے برابر یا مشابہ قرار دیا. اس عبارت پر علماے دیوبند کو بارہا چیلنج کیا گیا، مناظرے ہوئے مگر کوئی شخص بھی اس کا کھلا ہوا کفر آج تک نہ دھو سکا اور خود مصنف کو توبہ کی توفیق نہ ہوئی کہ متبعین کو ان پریشانیوں سے نجات ملتی. ظاہر ہے کہ ایسی

کھلی ہوئی گستاخی اور صریح توہین سے کفر کا حکم کیسے اٹھایا جا سکتا ہے. مگر جس فکر و مزاج کی خشت اول ہی اہانت انبیا پر رکھی گئی ہو وہ ایسی ہی شخصیت تلاش کرتا ہے اور اسی کے آستانہ انفرادیت پر سر خم کر دینا اپنے لئے باعث فخر و کمال سمجھتا ہے.

سلیمان ندوی کے سوانح نگار شاہ معین الدین ندوی لکھتے ہیں:-

"جب ان کی علمی عظمت و شہرت کا آفتاب نصف النہار پر تھا اس دور کے سب سے بڑے شیخ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے آستانے پر سر خم کر دیا".

"مولانا اشرف علی تھانوی صاحب سے ارادت کے بعد ان کے حلقہ میں بھی ان کو بڑی مقبولیت حاصل ہو گئی تھی".

(حیات سلیمان ص ۶۷۶)

ان تفصیلات کے بعد یہ سمجھنا ذرا بھی مشکل نہ رہا کہ تمام اکابر اسلام کے برخلاف باب فضائل میں بھی ضعیف احادیث کو نا معتبر کیوں ٹھہرایا گیا؟ بلکہ صحیح روایات سے ثابت ہونے کے باوجود بعض معجزات و فضائل کا انکار کیوں کیا گیا؟ اور قارئین کو فریب میں ڈالنے اور اس ناکردنی کو خوش نما بنانے کے لئے اس طرح کی دل کش عبارتیں کیوں تراشی گئیں کہ "معجزات ہوں یا فضائل ضرور ہے کہ آپ کی طرف جس چیز کی بھی نسبت کی جائے وہ شک و شبہہ سے پاک ہو". ؟؟

صرف اس لئے کہ سرکار کے فضائل و کمالات میں تقلیل و تنقیص کا ایک بیش بہا نسخہ ہاتھ آجائے. اور تقویت الایمانی فکر و مزاج کی تسکین کا بھرپور سامان فراہم ہو. ومن لم یجعل اللہ لہ نورا فما لہ من نور. کذلک یطبع اللہ علی قلب کل متکبر جبار.

مُعجزہ کیا ہے؟

حضرات انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سے ان کی نبوت کی صداقت ظاہر کرنے کے لیے کسی ایسی تعجب خیز چیز کا ظاہر ہونا جو عادۃً نہیں ہوا کرتی۔ اسی خلاف عادت ظاہر ہونے والی چیز کا نام "معجزہ" ہے۔

معجزہ چونکہ نبی کی صداقت ظاہر کرنے کے لیے ایک خداوندی نشان ہوا کرتا ہے، اس لیے معجزہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ خارقِ عادت ہو۔ یعنی ظاہری عِلَل واسباب اور عاداتِ جاریہ کے بالکل ہی خلاف ہو۔ ورنہ ظاہر ہے کہ کفار اس کو دیکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ یہ تو فلاں سبب سے ہوا ہے۔ اور ایسا تو ہمیشہ عادۃً ہوا ہی کرتا ہے۔ اس بنا پر معجزہ کے لیے یہ لازمی شرط ہے۔ بلکہ یہ معجزہ کے مفہوم میں داخل ہے کہ وہ کسی نہ کسی اعتبار سے اسبابِ عادیہ اور عاداتِ جاریہ کے خلاف ہو۔ اور ظاہری اسباب و عِلَل کے عمل دخل سے بالکل ہی بالاتر ہو تاکہ اس کو دیکھ کر کفار یہ ماننے پر مجبور ہو جائیں کہ چونکہ اس چیز کا کوئی ظاہری سبب بھی نہیں ہے اور عادۃً کبھی ایسا ہوا بھی نہیں کرتا۔ اس لیے بلاشبہہ اس چیز کا کسی شخص سے ظاہر ہونا انسانی طاقتوں سے بالاتر کارنامہ ہے۔ لہٰذا یقیناً یہ شخص اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا اور اس کا نبی ہے۔

معجزات کی چار قسمیں جب معجزہ کے لیے یہ ضروری اور لازمی شرط ہے کہ وہ کسی نہ کسی لحاظ سے انسانی طاقتوں سے بالاتر، اور عاداتِ جاریہ کے خلاف ہو۔ اس بنا پر اگر بغور دیکھا جائے تو خارقِ عادت ہونے کے اعتبار سے معجزات کی چار قسمیں ملیں گی جو حسب ذیل ہیں۔

اوّل :—— بذاتِ خود وہ چیز ہی ایسی ہے جو ظاہری اسباب و عادات کے بالکل ہی خلاف ہو جیسے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا چاند کو دو ٹکڑے کر کے دکھا دینا۔ حضرت

موسیٰ علیہ السلام کے عصا کا سانپ بن کر جادوگروں کے سانپوں کو نگل جانا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مُردوں کو زندہ کر دینا وغیرہ وغیرہ

دوم :—— بذات خود وہ چیز تو خلاف عادت نہیں ہوتی۔ مگر کسی خاص وقت پر بالکل ہی ناگہاں نبی سے اس کا ظہور ہو جانا، اس اعتبار سے یہ چیزیں خارق عادت ہو جایا کرتی ہیں۔ لہٰذا یہ بھی معجزہ ہی کہلائے گی۔ مثلاً جنگِ خندق میں اچانک ایک خوفناک آندھی کا آجانا جس سے کفار کے خیمے اکھڑ اکھڑ کر اُڑ گئے۔ اور بھاری بھاری دیگیں چولہوں پر سے الٹ پلٹ کر دور جا کر گر پڑیں —— یا جنگ بدر میں تین سو تیرہ کے مقابلے میں کفار کے ایک ہزار لشکر جرار کا جو مکمل طور پر مسلح تھے شکست کھا کر مقتول و گرفتار ہو جانا۔ ظاہر ہے کہ آندھی کا آنا، یا کسی لشکر کا شکست کھا جانا یہ بذاتِ خود کوئی خلاف عادت بات نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو ہمیشہ ہوا ہی کرتا ہے۔ لیکن اس ایک خاص موقع پر جب کہ رسول کو تائیدِ ربانی کی خاص ضرورت محسوس ہوئی بغیر کسی ظاہری سبب کے بالکل ہی اچانک آندھی کا آجانا، اور کفار کا باوجود کثرتِ تعداد کے قلیل مسلمانوں سے شکست کھا جانا اس کو تائیدِ خداوندی اور غیبی امداد و نصرت کے سوا کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا —— اس لحاظ سے یقیناً یہ عاداتِ جاریہ کے خلاف، اور ظاہری اسباب و عِلَل سے بالاتر ہے —— لہٰذا یہ بھی یقیناً معجزہ ہے۔

سوم :—— ایک صورت یہ بھی ہے کہ نہ تو بذاتِ خود وہ واقعہ خلافِ عادت ہوتا ہے، نہ اس کے ظاہر ہونے کے وقتِ خاص میں خلافِ عادت کوئی بات ہوتی ہے۔ مگر اس واقعہ کے ظاہر ہونے کا طریقہ بالکل ہی نادر الوجود، اور خلاف عادت ہوا کرتا ہے۔ مثلاً انبیاء علیہم السلام کی دعاؤں سے بالکل ہی ناگہاں پانی کا برسنا، بیماروں کا شفایاب ہو جانا، آفتوں کا ٹل جانا۔

ظاہر ہے کہ یہ باتیں نہ تو خلاف عادت ہیں، نہ ان کے ظاہر ہونے کا کوئی خاص وقت ہے، بلکہ یہ باتیں تو ہمیشہ ہوا ہی کرتی ہیں، لیکن جن طریقوں، اور جن اسباب سے یہ چیزیں وقوع پذیر ہوئیں کہ ایک دم ناگہاں نبی نے دعا مانگی اور بالکل ہی اچانک یہ چیزیں ظہور میں

آگئیں۔ اس اعتبار سے یقیناً بلاشبہہ یہ ساری چیزیں خارقِ عادات اور ظاہری اسباب سے الگ اور بالاتر ہیں ——— لہٰذا یہ چیزیں بھی معجزات ہی کہلائیں گی۔

چہارم: ——— کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ نہ تو خود واقعہ عاداتِ جاریہ کے خلاف ہوتا ہے، نہ اس کا طریقۂ ظہور خارقِ عادت ہوتا ہے، لیکن بلا کسی ظاہری سبب کے نبی کو اس واقعہ کا قبل از وقت علمِ غیب حاصل ہو جاتا، اور واقعہ کے وقوع سے پہلے ہی نبی کا اس واقعہ کی خبر دے دینا یہ خلافِ عادت ہوتا ہے ——— مثلاً حضرات انبیاء علیہم السلام نے واقعات کے ظہور سے بہت پہلے جو غیب کی خبریں دی ہیں، یہ سب واقعات اِس اعتبار سے خارقِ عادات اور معجزات ہیں۔ چنانچہ مسلم شریف کی روایت ہے کہ ایک روز بہت ہی زور دار آندھی چلی۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے باہر تشریف فرما تھے آپ نے اُسی جگہ فرمایا کہ یہ آندھی مدینہ کے ایک منافق کی موت کے لیے چلی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جب لوگ مدینہ پہونچے تو معلوم ہوا کہ مدینہ کا ایک منافق اس آندھی سے ہلاک ہو گیا۔

(مشکوٰۃ شریف ج ۲، ص ۵۲۷، باب المعجزات)

غور کیجیے کہ اس واقعہ میں نہ تو آندھی کا چلنا خلافِ عادت ہے، نہ کسی آدمی کا اس سے ہلاک ہونا اسبابِ عادات کے خلاف ہے۔ کیونکہ آندھی ہمیشہ آتی ہی رہتی ہے۔ اور آندھی میں ہمیشہ آدمی مرتے ہی رہتے ہیں ——— لیکن اس واقعہ کا قبل از وقت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو علم ہو جانا، اور آپ کا لوگوں کو اس غیب کی خبر پر قبل از وقت مطلع کر دینا، یقیناً بلاشبہہ خرقِ عادات اور معجزات میں سے ہے۔

انبیائے سابقین، اور خاتم النبیین کے معجزات

ہر نبی کا معجزہ چونکہ اس کی نبوت کے ثبوت کی دلیل ہوا کرتا ہے، اس لیے خداوند عالم نے ہر نبی کو اس کے دور کے ماحول، اور اس کی امت کے مزاج، عقل و فہم کے مناسب معجزات سے نوازا۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں چونکہ جادو، اور ساحرانہ کارنامے اپنی ترقی کی اعلیٰ ترین منزل پر پہونچے ہوئے تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو "یدِ بیضا" اور "عصا" کے معجزات عطا فرمائے، جن سے آپ نے جادوگروں کے ساحرانہ

کارناموں پر اس طرح غلبہ حاصل فرمایا کہ تمام جادوگر سجدہ میں گر پڑے ——— اور آپ کی نبوت پر ایمان لے آئے۔

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں علمِ طب انتہائی معراج پر پہونچا ہوا تھا۔ اور اس دور کے طبیبوں اور ڈاکٹروں نے بڑے بڑے امراض کا علاج کر کے اپنی فنی مہارت سے تمام انسانوں کو مسحور کر رکھا تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مادر زاد اندھوں اور کوڑھیوں کو شفا دینے اور مُردوں کو زندہ کر دینے کا معجزہ عطا فرمایا جس کو دیکھ کر دورِ مسیحی کے اطبا، اور ڈاکٹروں کے ہوش اڑ گئے اور وہ حیران و ششدر رہ گئے۔ اور بالآخر انہوں نے اِن معجزات کو انسانی کمالات سے بالاتر مان کر آپ کی نبوت کا اقرار کر لیا۔

اسی طرح حضرت صالح علیہ السلام کے دورِ بعثت میں سنگ تراشی اور مجسمہ سازی کے کمالات کا بہت ہی چرچا تھا۔ اس لیے خداوند قدوس نے آپ کو یہ معجزہ عطا فرما کر بھیجا کہ آپ نے ایک پہاڑی کی طرف اشارہ فرما دیا تو اس کی ایک چٹان شق ہو گئی۔ اور اس میں سے ایک بہت ہی خوبصورت اور تندرست حاملہ اونٹنی نکل پڑی جس نے فوراً بچہ جنا۔ آپ نے فرمایا۔ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً (یہ اللہ کی اونٹنی ہے جو تمہارے لیے معجزہ بن کر آئی ہے) حضرت صالح علیہ السلام کی قوم آپ کا یہ معجزہ دیکھ کر ایمان لائی۔

الغرض اسی طرح ہر نبی کو اس دور کے ماحول کے مطابق، اور اس کی قوم کے مزاج اور ان کی افتادِ طبع کے مناسب کسی کو ایک، کسی کو دو، کسی کو اس سے زیادہ معجزات ملے۔ مگر ہمارے حضور نبیِ آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ تمام نبیوں کے بھی نبی ہیں۔ اور آپ کی سیرت مقدسہ تمام انبیاء علیہم السلام کی مقدس زندگیوں کا خلاصہ، اور آپ کی تعلیم تمام انبیاء کرام کی تعلیمات کا عطر ہے۔ اور آپ دنیا میں ایک عالمگیر اور ابدی دین لے کر تشریف لائے تھے۔ اور اولین و آخرین کی تمام اقوام و ملل آپ کی مقدس دعوت کی مخاطب تھیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات مقدسہ کو انبیاء سابقین کے تمام معجزات کا مجموعہ بنا دیا۔ اور آپ کو قسم قسم کے ایسے بیشمار معجزات سے سرفراز فرمایا جو ہر طبقہ، ہر گروہ، ہر قوم، اور تمام اہلِ مذاہب کے مزاج عقل و فہم کے لیے ضروری تھے۔ اسی لیے آپ کی صورت و سیرت، آپ کی سنت و شریعت، آپ کے

اخلاق و عادات، آپ کے دن رات کے معمولات، غرض آپ کی ذات وصفات کی ہر ہر ادا اور ایک ایک بات اپنے دامن میں معجزات کی ایک دنیا لیے ہوئے ہے۔ آپ پر جو کتاب نازل ہوئی وہ آپ کا سب سے بڑا اور قیامت تک باقی رہنے والا ایسا ابدی معجزہ ہے جس کی ہر ہر آیت، آیاتِ بیّنات کی کتاب، اور جس کی سطر سطر معجزات کا دفتر ہے۔ آپ کے معجزات عالمِ اعلیٰ اور عالمِ اسفل کی کائنات میں اس طرح جلوہ فگن ہوئے کہ فرش سے عرش تک آپ کے معجزات کی عظمت کا ڈنکا بج رہا ہے۔ روئے زمین پر جمادات، نباتات، حیوانات کے تمام عالموں میں آپ کے طرح طرح کے معجزات کی ایسی ہمہ گیر حکمرانی و سلطنت کا پرچم لہرایا کہ بڑے بڑے منکروں کو بھی آپ کی صداقت و نبوت کے آگے سرنگوں ہونا پڑا۔ اور معاندین کے سوا ہر انسان خواہ وہ کسی قوم و مذہب سے تعلق رکھتا ہو، اور اپنی افتادِ طبع اور مزاجِ عقل کے لحاظ سے کتنی ہی منزلِ بلند پر فائز کیوں نہ ہو، مگر آپ کے معجزات کی کثرت، اور ان کی نوعیت و عظمت کو دیکھ کر اس کو اس بات پر ایمان لانا ہی پڑا کہ بلاشبہہ آپ نبیِ برحق اور خدا کے سچے رسول ہیں خود آپ کی جسمانی و روحانی خداداد طاقتوں پر اگر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ آپ کی حیاتِ مقدسہ کے مختلف دَور کے محیر العقول کارنامے بجائے خود عظیم سے عظیم تر معجزات ہی معجزات ہیں کبھی عرب کے ناقابلِ تسخیر پہلوانوں سے کشتی لڑ کر ان کو پچھاڑ دینا، کبھی چشم زدن میں فرشِ زمین سے سدرۃ المنتہیٰ پر گزرتے ہوئے عرشِ معلیٰ کی سیر، کبھی انگلیوں کے اشارہ سے چاند کے دو ٹکڑے کر دینا، کبھی ڈوبے ہوئے سورج کو واپس لوٹا دینا، کبھی خندق کی چٹان پر پھاوڑا مار کر روم و فارس کی سلطنتوں میں اپنی امت کو پرچم اسلام لہراتا ہوا دکھائی دینا، کبھی انگلیوں سے پانی کے چشمے جاری کر دینا، کبھی مٹھی بھر کھجور سے ایک سو بھوکے لشکر کو اس طرح راشن دینا کہ ہر سپاہی نے شکم سیر ہو کر کھالیا، وغیرہ وغیرہ معجزات کا ظاہر کر دینا یقیناً بلاشبہہ یہ وہ معجزانہ واقعات ہیں کہ دنیا کا کوئی بھی سلیم العقل انسان ان سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ماخوذ

از: سیرۃ المصطفیٰ، مصنفہ: علامہ عبد المصطفیٰ اعظمی علیہ الرحمہ

شبلی نعمانی کے متعلق کچھ حقائق

میثم عباس رضوی

massam.rizvi@gmail.com

شبلی نعمانی کی زندگی اور عقائد و نظریات کے بارے میں دیوبندی وہابی علماء کی تحریروں سے حقائق قارئین کے سامنے پیش کیے جا رہے تا کہ آپ پر شبلی نعمانی کی زندگی کے وہ شرمناک حقائق منکشف ہوں جن سے آپ بے خبر ہیں۔

شبلی نعمانی کی ارکان اسلام کی بجا آوری میں بے پروائی:

شبلی کے سیرت نگار شیخ اکرام نے لکھا ہے کہ:

''مولانا محمد فاروق کی صحبت و تعلیم نے ہونہار شاگرد کے ذہن کو جلا دے دی لیکن شبلی کا وہ رنگِ طبیعت جس پر بعد میں محتاط اور متقی علماء کی جماعت معترض ہوئی اس صحبت میں پرورش پاتا رہا اور شاگرد کے علاوہ استاد میں بھی جلوہ نما تھا۔ مولانا فاروق اس زمانے کے مشہور عالم تھے لیکن شبلی کی فطرت تشویت اور بوقلمونی ان میں بھی موجود تھی وہ بہ یک وقت مذہبی عالم اور عدالتی وکیل تھے مذہبی درس گاہوں کی بھی وہ رونق تھے اور فنِ موسیقی پر بھی فریفتہ تھے شمع علم کے بھی وہ شیدا تھے اور عشقیہ شعر بھی خوب لکھتے تھے مذہبی بحثوں میں بڑے جوش سے حصہ سے تھے لیکن ارکانِ مذہب کی بجا آوری میں بقول شبلی خود بے پروا تھے۔ وہ خود ایک مثنوی میں اپنی طبیعت کا نقشہ کھینچتے ہیں۔

نمے بینی کہ طرفہ بلبلم من — کزیں اعجوبہ ہر محفلم من
بر میدان نمو دم ترکتازی — غواندم نامہ ترکی و تازی
گہے از لوح رازی خواندہ ام حرف — گے از حرفِ تازی بستہ ام طرف
گہے اندر مقامِ لحنِ شیراز — شدم با اہلی و سعدی ہم آواز

گہے در بزم گاہِ نغمہ سازی　　سخن راندم بآہنگِ حجازی
حسودا! آں فروزاں گوہرم من　　کہ شمع من بہ ہر بزمے است روشن

چنانچہ شاگرد پر بھی یہی رنگ چڑھ گیا جو بعد میں اس کی سے وساطت سے طلبائے ندوہ کو وراثت میں ملا۔''

(شبلی نامہ صفحہ ۲۶، ۲۷ مطبوعہ تاج آفس محمد علی روڈ بمبئی)

شبلی نعمانی کی وکالت کے امتحان میں ناکامی:

شیخ محمد اکرام صاحب لکھتے ہیں کہ:

''مولانا (شبلی) کے والد نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ وکالت کا امتحان پاس کرے اعظم گڑھ میں وکالت شروع کر دیں چنانچہ شبلی نے تیاری شروع کی اور ۱۸۷۹ء میں وکالت کے امتحان میں شریک ہوئے لیکن وہ پہلی مرتبہ ناکام رہے۔''

(شبلی نامہ صفحہ ۳۴ مطبوعہ تاج آفس محمد علی روڈ بمبئی)

قارئین کرام! جس طرح شبلی نعمانی کو وکالت کے امتحان میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا بالکل اسی طرح مرزا قادیانی نے بھی مختاری کے امتحان کے لیے قانون کی کتابوں کا مطالعہ کیا لیکن ناکام ہوا۔

(سیرۃ المہدی حصہ اوّل مصنف بشیر احمد قادیانی)

شبلی نعمانی کی انگریز نوازی:

شیخ محمد اکرام صاحب نے لکھا ہے کہ شبلی نعمانی نے

''ایک طویل نظم اعظم گڑھ کے کسی انگریز افسر کو خوش کرنے کو لکھی گئی اس میں انگریزوں کی فتح کابل و قندھار کا حال ہے۔''

(شبلی نامہ صفحہ ۴۱ مطبوعہ تاج آفس محمد علی روڈ بمبئی)

اسی کتاب میں ایک جگہ لکھا ہے کہ:

''مولانا (یعنی شبلی نعمانی) نے الندوہ کی ایک اشاعت میں ایک مضمون لکھا جس میں یہ ثابت کیا تھا کہ مسلمانوں پر انگریزی حکومت کی وفاداری سیاسی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ مذہبی احکام کی رو سے بھی فرض ہے۔''

(شبلی نامہ صفحہ ۱۳۸ مطبوعہ تاج آفس محمد علی روڈ بمبئی)

اس کے حاشیہ میں شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے کہ:

''سید سلیمان ندوی حیات شبلی میں لکھتے ہیں کہ یہ مضمون لکھ کر گویا مولانا نے گورنمنٹ کو اس کے اس چھ ہزار سالانہ امداد کی قیمت ادا کی جو اس نے دارالعلوم کو دینا منظور کی تھی۔ لیکن یہ مضمون ستمبر ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا اور گرانٹ دس نومبر ۱۹۰۸ء کو جاری ہوئی۔ ظاہر ہے کہ یہ مضمون ایک احسان کا معاوضہ نہ تھا بلکہ اگر مضمون اور سرکاری گرانٹ میں کوئی تعلق ہے تو زرِ امدادی کو اس وفادارانہ فتویٰ کا انعام سمجھنا چاہیے۔ سید سلیمان یہ بھی لکھتے ہیں کہ مولانا نے ردمختار کے جس فقرے پر اپنے نظریہ کی بنیاد رکھی ہے اس کا ترجمہ انہوں نے بالکل غلط کیا ہے۔''

(شبلی نامہ صفحہ ۱۳۸ مطبوعہ تاج آفس محمد علی روڈ بمبئی)

''ندوہ کے معاون اور شبلی کے دوست منشی مشیر حسین قدوائی نے ایک انگریزی اخبار میں ایک مضمون لکھ کر محکمۂ تعلیمات سے خواہش ظاہر کی کہ وہ ندوہ کو امداد دے اس مضمون کے جواب میں محکمہ تعلیمات کے آفیسر نے منشی صاحب کو لکھا اگر ندوہ کو مدد کی ضرورت ہے تو وہ گورنمنٹ کے پاس درخواست بھیج سکتا ہے چنانچہ ندوہ سے ''مالی اور عزازی'' امداد کی درخواست بھیجی گئی اور طرفین کی خط کتابت کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت نے ندوہ کو پانچ سو روپے ماہوار کی امداد اس شرط پر دینی قبول کی کہ یہ رقم مدرسہ کی غیر مذہبی و تعلیم یعنی انگریزی، ریاضی، عربی، ادب وغیرہ پر خرچ ہو۔''

(شبلی نامہ صفحہ ۱۳۸، ۱۳۹ مطبوعہ تاج آفس محمد علی روڈ بمبئی)

شیخ اکرام نے شبلی نعمانی کے اپنے الفاظ یوں نقل کیے ہیں:

"۱۹۰۸ء میں مَیں نے الندوہ میں ایک مستقل مضمون کے ذریعے یہ ثابت کیا کہ مسلمانوں پر انگریزی حکومت کی اطاعت و وفاداری مذہباً فرض ہے اور اسی سال ندوہ کے سالانہ جلسہ میں وفاداری کا ایک رزولیوشن بھی پاس کروایا۔"

(شبلی نامہ صفحہ ۲۴۵، ۲۴۶)

انگریز نواز علماء سوء:

"مقدس علماء عیسائی فرمانروا کے سامنے دلی شکر گزاری کے ساتھ ادب سے خم تھے۔"

(شبلی نامہ صفحہ ۱۴۰)

یہ علماء مقدس نہیں بلکہ علمائے سوء تھے جو شبلی نعمانی کے ہمنوا بن کر ایک کافر کے سامنے ادب کے ساتھ کھڑے تھے۔

عیسائی حکمران کے ہاتھوں الندوہ کا سنگ بنیاد:

"یہ پہلا ہی موقع تھا کہ ایک مذہبی درسگاہ کا سنگِ بنیاد ایک غیر مذہب کے ہاتھ سے رکھا جا رہا تھا۔"

(شبلی نامہ صفحہ ۱۴۰)

کتنے شرم کی بات ہے جسے شبلی نعمانی نے بڑے فخر کے ساتھ بیان کیا ہے۔

شبلی کا معاشقہ:

"سیرت النبی" کے مولف کو (جنہیں معجزات رسول سے تو خدا واسطے کا کایَر تھا) ادھیڑ عمر میں ایک لڑکی کے ساتھ عشق ہو گیا تھا۔ اس کی کچھ تفصیل شیخ محمد

اکرام کی کتاب "شبلی نامہ" سے ذیل میں نقل کی جاتی ہے۔ شیخ محمد اکرام صاحب لکھتے ہیں کہ:

"خطوط شبلی میں عطیہ بیگم صاحبہ اور زہرا بیگم صاحبہ دونوں کے نام خطوط ہیں لیکن زیادہ تر عطیہ صاحبہ سے خطاب ہے اور مولانا کو اس قابل اور باکمال بہت سالہ لڑکی نے جس طرح مسحور و بیخود بنا دیا تھا اس کا اندازہ خطوطِ شبلی کے صفحے صفحے سے ہوتا ہے وہ عطیہ بیگم کی بعض خوبیوں کا ذکر کر کے انہیں لکھتے ہیں۔ "ان باتوں کے ساتھ اگر تم موسیقی سے بھی واقف ہو تو اجازت دو کہ لوگ تم کو پُوجیں و انا اوّل العابدین (اور میں سب سے پہلا پُجاری ہوں گا) ایک اور خط کا آغاز ہے۔

رگِ سنگم شرارے مے نویسم کفِ حاکم غبارے مے نویسم

قرۃ عینی تمہارا خط جو مدت کے بعد ملا تو بے ساختہ میں نے آنکھوں سے لگایا اور دیر تک بار بار پڑھتا رہا۔ ایک اور جگہ اپنے ایک شعر کا جس میں کنایتہً عطیہ صاحبہ کا نام آتا تھا۔ لکھتے ہیں اسی اصول پر میرا یہ شعر بھی ہے اور یوں صراحتاً تمہارے لیے خیر مقدم وغیرہ سب لکھ چکا ہوں اور عطیہ! لکھنے پڑھنے کی کیا بات ہے میرا ہر رونگٹا اور ہر موئے بدن تمہاری توصیف اور تعریف کا ایک شعر ہے۔"

(شبلی نامہ صفحہ ۱۵۴ تا ۱۵۶)

قارئین کرام! آپ نے ملاحظہ کیا کہ شبلی نعمانی صاحب کس طرح ایک نامحرم لڑکی سے اپنی والہانہ محبت کا اظہار کرتے ہوئے اس کے پہلے پجاری ہونے کا اعلان فرما رہے ہیں۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معجزات رسول پر تنقید کرنے والے شبلی نعمانی کو یہاں شرک کیوں نظر نہیں آیا؟ مزید لطف یہ کہ جس طرح مرزا قادیانی ہزار کوشش کے باوجود محمدی بیگم کو حاصل نہ کر سکا اسی طرح شبلی نعمانی بھی عطیہ بیگم کو حاصل کرنے میں ناکام رہے۔

''شبلی نعمانی کی معشوقہ کا بیان'':

شیخ محمد اکرام صاحب نے لکھا ہے کہ:

''خوش قسمتی سے پچھلے دنوں خود عطیہ بیگم صاحبہ کے قلم سے مولانا شبلی اور خاندانِ فیضی کے تعلقات پر ایک مختصر سا مضمون شائع ہوا ہے جسے ہم اس کی اہمیت کے لحاظ سے ضمیمہ کے طور پر تمام کا تمام نقل کرتے ہیں تاکہ غلط فہمیوں کی کوئی گنجائش نہ رہے۔ عطیہ بیگم صاحبہ کے مضمون کا ماحصل یہ ہے کہ ان کے گھر میں، مولانا کا استقبال بطور ایک عالم ایک بزرگ اور ایک بہت بڑے مذہبی مشن کے مبلغ کی طرح ہوا لیکن ان کے دل میں اور ہی جذبات بھڑک اُٹھے جن کی تندی و تیزی سے وہ بے خبر تھیں۔''

(شبلی نامہ صفحہ ۱۵۴، ۱۵۵)

قارئین کرام! یہ ہے شبلی نعمانی کی مجوزہ ''معشوقہ'' کا بیان جس سے شبلی نعمانی کی ''رنگین'' طبیعت پر مزید روشنی پڑتی ہے۔

آزاد خیال عورتوں کے ساتھ میل جول اور اسلامی پردے کی مخالفت:

شیخ محمد اکرام صاحب نے شبلی کی زندگی کے اس پہلو کے متعلق لکھا ہے کہ وہ:

''نہایت آزاد خیال عورتوں کی سوسائٹی میں بے تکلف شرکت کرتے تھے اور رواجی پردے کے علمی و عملی طور پر مخالف تھے۔''

(شبلی نامہ صفحہ ۲۷۴)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ''سیرت النبی ﷺ'' کے مولف شبلی نعمانی کو اس بات کا خیال کیوں نہ آیا کہ صاحب سیرت (یعنی رسول اللہ ﷺ) عورتوں کے

پردہ کی بہت زیادہ پابندی فرماتے تھے۔

شبلی نعمانی کے حامیوں سے یہ سوال ہے کہ اسلامی پردہ کی علمی و عملی مخالفت کرکے از روئے انصاف شبلی نعمانی رسول اللہ ﷺ کے مخالف ثابت ہوئے یا نہیں اگر نہیں تو کیوں؟

شبلی نعمانی کا افیون کھانا:

شیخ محمد اکرام صاحب نے ''شبلی نامہ'' میں شبلی نعمانی مولف ''سیرت النبی ﷺ'' کے متعلق لکھا ہے کہ:

''نومبر ۱۹۱۳ء میں انہوں نے افیون کھانی شروع کر دی تھی۔''

(شبلی نامہ صفحہ ۲۶۸)

غالباً ''سیرت النبی ﷺ'' بھی افیون ہی کھا کر لکھی ہوگی جیسا کہ ''سیرت النبی ﷺ'' میں کثیر اغلاط بھی اسی پر شاہد ہیں۔

والدین کی نافرمانی:

شیخ محمد اکرام صاحب نے شبلی کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے کہ:

''والد کی تقسیم جائیداد سے تو وہ اتنے جزبز ہوئے کہ شریعت کے احکام اور والدین کی اطاعت کے اصولوں کو بھی بھول گئے۔''

(شبلی نامہ صفحہ ۱۳۶)

جب رسول اللہ کا احترام نہ رہا تو والدین کا احترام کیا معنی رکھتا ہے؟

شبلی نعمانی کا معتزلہ کی جانب رجحان:

دورِ حاضر کے مشہور دیو بندی ڈاکٹر خالد محمود مانچسٹروی نے شبلی نعمانی کے متعلق لکھا ہے کہ:

''اکابر دیوبند اور مولانا شبلی نعمانی کا کئی باتوں میں شدید اختلاف تھا ..... مولانا شبلی کی فکر بعض تعبیرات میں معتزلہ کے قریب جا رہی تھی۔''

(ماہنامہ الرشید (ساہیوال) دارالعلوم دیوبند نمبر صفحہ ۴۴۹ فروری مارچ ۱۹۷۶ء)

مولوی شہاب الدین ندوی دیوبندی کی جانب سے شبلی نعمانی و سلیمان ندوی وغیرہ کا رد:

مولوی احمد رضا بجنوری دیوبندی نے شبلی نعمانی کی اغلاط کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''مولانا شہاب الدین ندوی نے جو نقد علماء مصر شیخ محمد عبدہ وغیرہ اور سر سید و علامہ شبلی اور مولانا آزاد و حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی روش پر کیا ہے وہ نہایت اہم ہے۔''

(ملفوظات محدث کشمیری صفحہ ۱۹۱ مطبوعہ ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ ملتان)

اس کے بعد مولوی احمد رضا بجنوری دیوبندی نے مزید لکھا ہے کہ:

''اس مضمون کو پڑھ کر علماء مصر محمد عبدہ وغیرہ اور ہندوستان کے علماء مولانا آزاد حضرت سید (سلیمان ندوی) صاحب' علامہ شبلی اور سر سید و ڈاکٹر اقبال کے مسا محات پر مطلع ہو کر بڑا افسوس ہوا۔''

(ملفوظات محدث کشمیری صفحہ ۱۹۳ مطبوعہ ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان)

مولوی انور شاہ کشمیری دیوبندی کا شبلی نعمانی پر فتویٰ کفر:

دیوبندیوں کے محدث اعظم مولوی انور شاہ کشمیری کی طرف سے شبلی نعمانی پر فتویٰ کفر ذیل میں ملاحظہ کریں جس میں لکھا ہے کہ:

اتعجب من المورخ الشهير بالهند شبلی النعمانی صاحب کتاب سیرة

النبی الفاروق وغیرهمه انه کیف یعتقد فی ذالك الرجل ..... هل هی مداهنة دینیه لمصالح مشترکه او ذالك من ائتلاف ارواحهما و اشتراك مقاصد هما فی العلم و الفهم ..... و انما ابوبه علی اعین الناس اذ لیس من الدین ان یغمض عن کافر.

اس عبارات کا خلاصہ یہ ہے کہ ''بے شک شبلی سر سید کے بارے میں لاحد خوش اعتقادی رکھتا ہے..... پس یا تو یہ مداہنۃ فی الدین ہے اور دونوں (سر سید و شبلی) کی روحیں علم و مقاصد میں یک جا ہیں..... اور ہم نے لوگوں کے سامنے شبلی کا یہ پول اس لیے ظاہر کیا ہے کہ دین اسلام میں کس کافر کے کفر سے چشم پوشی کرنا جائز نہیں۔''

(یتیمۃ البیان مقدمہ مشکلات القرآن صفحہ ۵۲ مطبوعہ ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان)

مولوی اشرف علی تھانوی دیوبندی کا شبلی نعمانی وغیرہ پر فتویٰ کفر:

مولوی عبد الماجد دریا آبادی نے اپنی کتاب حکیم الامت میں لکھا ہے کہ ''مولانا تھانوی کا فتویٰ شائع ہو گیا۔ مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین فراہی کافر ہیں اور چونکہ مدرسہ انہی دونوں کا مشن ہے اس لیے مدرسۃ الاصلاح، مدرسۂ کفر و زندقہ ہے اور اس کے تمام متعلقین کافر و زندیق ہیں۔ یہاں تک کہ جو علماء اس مدرسہ کے جلسوں میں شرکت کریں وہ بھی ملحد و بے دین ہیں۔''

(حکیم الامت صفحہ ۴۱۸ مطبوعہ مکتبہ مدنیہ اُردو بازار لاہور)

مولوی اشرف علی تھانوی دیوبندی کی جانب سے شبلی نعمانی کی کتاب ''سیرت النبیؐ'' کا شدید رد:

مولوی اشرف علی تھانوی نے شبلی کی کتاب کا رد کرتے ہوئے لکھا کہ:

''ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ فلاں صاحب نعمانی (یہ نعمانی خوب لگایا جس سے دھوکہ ہوتا ہے کہ شاید امام صاحب کی اولاد میں ہوں) یہ بھی سرسید احمد خان کے قدم بقدم ہی ہیں۔ سیرت نبوی لکھی ہے جس پر آج کل کے نیچری فریفتہ ہیں۔ حضور ﷺ کی دو شانیں ہیں۔ نبوت، سلطنت۔ ان میں سے صرف ایک شان سلطنت کو ان لوگوں نے لیا اسی کو شبلی نے بھی لیا ہے۔ دوسری شان کو قریب قریب چھوڑ دیا یہ لوگ اس کو بڑا کمال سمجھتے ہیں حالانکہ اصل شان نبوت ہے۔ ملکیت اُس کی تابع ہے مگر اس کا کہیں نام و نشان نہیں یہ سب نیچریت کا اثر ہے ان لوگوں کے قلوب میں نہ دین ہے نہ کسی کی دینی عظمت خود انبیاء علیہم السلام کی نہیں اولیاء کی تو کیا ہوتی۔ نمونہ کے طور پہ معراج ہی کو لیجئے اس میں کس قدر گڑ بڑ مچا رکھی ہے حالانکہ موٹی بات ہے اگر حضور کو خواب ہی میں معراج ہوتی بیداری میں نہ ہوتی تو جس وقت کفار نے تکذیب کی اور کہا کہ بیت المقدس کا نقشہ بیان کرو اور فلاں فلاں چیزیں بتلاؤ تو حضور فرما دیتے کہ وہ تو ایک خواب تھا۔ اس سوال سے آپ کو خاص اہتمام کیوں ہوتا اور یہ اختلاف ہی نہ پڑتا۔ اسی حالت میں ان لوگوں کا اقرار شرائع ایسا ہی ہے جیسے کسی سر پڑی چیز کا نباہنا پڑ جاتا ہے جو جی میں آیا لکھ مارا نہ اصول ہیں نہ نقول محض ناکافی عقل سے کام لینا چاہتے ہیں یہ نہیں سمجھتے کہ جب سلف کا اتنا بڑا طبقہ کسی چیز کا قائل ہے یہ اتنا ہی سمجھ لیتے خدا معلوم ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے جب اس قدر فہم اور عقل اور سمجھ نہیں تو پھر اپنے منصب سے زیادہ مباحث میں کیوں دخل دیتے ہیں۔ عقلاً و نقلاً محقق ہے نصوص اپنے ظاہر پر محمول ہوتے ہیں جب تک کوئی قوی صارف نہ ہو ورنہ پھر نصوص کوئی چیز ہی نہ رہیں گے جو جس کے خیال میں آیا یا اپنی رائے میں آیا کہہ دیا پھر یہ کہ تمہاری کوئی کس طرح ماننے لگا جب کہ سلف کے اتنے بڑے طبقہ کی تم نہیں مانتے پھر تو سب معاملہ ہی درہم برہم ہو جائے گا پھر جب بزعم تمہارے حضور ﷺ اور

صحابہ کرام تابعین، تبع، تابعین، ائمہ مجتہدین کسی مسئلہ کو نہ سمجھ سکے تو تم بدعقل بدفہم کیا سمجھو گے۔'' چہ نسبت خاک را با عالم پاک'' اصل بات یہ ہے کہ ان لوگوں کی نظر بالکل سطحی ہوتی ہے گو کسی کی وسیع بھی ہو کیونکہ وسعت تو تبحر ہے مگر خود تبحر کی دو قسمیں ہیں جو ایک مولوی صاحب نے بیان کی تھیں کہ ایک کدو تبحر ہے ایک مچھلی تبحر۔ سو کدو تو اوپر اوپر پھرتا ہے اور تمام سمندر کو دیکھ لیتا ہے مگر اس کو قعر دریا کی خبر نہیں اور مچھلی عمق پر پہنچتی ہے سو یہ آج کل کے اس قسم کے لوگ اگر تبحر بھی ہوں تو کدو تبحر ہیں اوپر اوپر پھرتے ہیں حقیقت کی کچھ خبر نہیں پس ان لوگوں کو چند چیزیں یاد ہیں وہ بھی ''کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا'' نہ مبادی ہیں نہ اصول نہ فروع من گھڑت جو جی چاہا جو منہ میں آیا بک دیا یا لکھ مارا ساری دُنیا کو اپنی طرح اندھا سمجھتے ہیں اس کا بھی تو ان لوگوں کا خیال نہیں کہ آخر اور بھی تو دُنیا میں پڑھے لکھے لوگ موجود ہیں۔ وہ ہماری ان لچر اور بیہودہ تحریرات کو دیکھیں گے تو کیا کہیں گے یہ سب قلوب میں دین نہ ہونے کے آثار ہیں اللہ بچائے بددینی اور جہل سے یہ دونوں بُری بلائیں ہیں۔

(الافاضات الیومیہ جلد ۶ صفحہ ۳۳۷ تا ۳۳۹ ناشر المکتبہ الاشرفیہ جامعہ اشرفیہ فیروز پور روڈ لاہور)

کتاب ''سیرت النبی ﷺ'' میں ملحدانہ نظریات:

مولوی مجاہد الحسینی دیو بندی نے اپنی کتاب ''علمائے دیو بند عہد ساز شخصیات'' میں دیو بندی مولوی عتیق الرحمٰن عثمانی کا ایک مضمون شامل کیا ہے اس مضمون میں سیرت النبی کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''جون ۱۹۱۴ء کی بات ہے کہ سیرۃ النبی کا مقدمہ ملک کے ایک شہرہ آفاق ہفتہ وار اخبار میں شائع ہوا اس کا شائع ہونا تھا کہ بعض اہل علم نے جن میں شاید کچھ

دیوبندی خیال کے اصحاب بھی شامل تھے منظم طریقے پر بیگم صاحبہ بھوپال تک یہ شکایت پہنچائی کہ آپ جس چیز کی اعانت کر رہی ہیں وہ دین نہیں الحاد کی اعانت ہے۔"

(علمائے دیو بند عہد ساز شخصیات صفحہ ۱۱۵ ناشر سیرت مرکز ۶۵۔ بی پیپلز کالونی فیصل آباد تقسیم کار مکتبہ سید احمد شہید اُردو بازار لاہور)

شبلی نعمانی کی قادیانیت نوازی:

مولوی محمد داؤد ارشد غیر مقلد وہابی نے شبلی نعمانی کی قادیانیت نوازی کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"مولانا شبلی نعمانی تو اس بات کے خواہاں تھے کہ مرزا محمود احمد جو اس وقت قادیانی خلافت پر متمکن تھے ان کے ساتھ مل کر اسلام کی اشاعت کا کام لیا جائے۔"

(القول الفصیح فی احوال نداء مسیح صفحہ ۸ ناشر جماعت اہلحدیث کوٹلی ورکاں مضافات نارنگ منڈی)

اس کے بعد مزید لکھا ہے کہ:

"مولانا شبلی نعمانی خواجہ کمال الدین کی مبلغانہ صلاحیتوں اور کاروائیوں کا وسیع ظرفی سے اعتراف فرماتے ہیں کہ انہوں نے ۱۹۱۲ء سے لے کر ۱۹۳۲ء تک اپنی پوری بیس برس زندگی اسلام کی تبلیغ اور اس کے محاسن کی اشاعت اور یورپ میں اسلامی لٹریچر کی فراہمی میں صَرف کی۔ افسوس کہ ان کی موت سے دُنیا کی مذہبی بزم میں ایک اہم جگہ خالی ہوگئی۔" (یاد رفتگان از مولانا سلیمان ندوی صفحہ ۱۵۰)

(القول الفصیح فی احوال نداء مسیح صفحہ ۸، ۹ ناشر جماعت اہلحدیث کوٹلی ورکاں مضافات نارنگ منڈی)

قارئین کرام! یہ تھے شبلی نعمانی کی زندگی کے وہ شرمناک حقائق جن کے

مطالعے سے آپ کو یہ فیصلہ کرنے میں مشکل پیش نہیں آئے گی کہ ان عقائد و عادات کا حامل شخص قطعاً "سیرت النبی ﷺ" جیسے پاکیزہ موضوع پر لکھنے کا اہل نہیں۔ یہ یاد رہے کہ یہ حقائق ہم نے دیو بندی وہابی فکر کے علماء و مفکرین کی کتب سے پیش کیے ہیں۔

کچھ اس کتاب کے بارے میں

کتاب "سیرت النبی ﷺ" میں جس طرح معجزات رسول ﷺ کو ہدف تنقید بنایا ہے اس کا نہایت شاندار و علمی محاکمہ انڈیا کے مشہور و معروف عالم دین مولانا محمد احمد مصباحی حفظ اللہ نے کیا ہے ماشاء اللہ۔ یہ کتاب شبلی و سلیمان ندوی کے رد میں لکھی گئی بہترین کتابوں میں سے ہے۔ یہ کتاب میں نے محترم محمد ابرار قادری صاحب کے پاس دیکھی میری خواہش پر یہ کتاب انہوں نے مجھے عنایت کر دی۔ پاکستان میں چونکہ یہ کتاب پہلے شائع نہیں ہوئی تھی اس لیے میں نے مدیر و ناظم ادارہ النوریہ رضویہ پبلشنگ کمپنی حاجی محمد محفوظ احمد قادری اور ان کے صاحبزادگان محمد مصطفیٰ اشرف و محمد مختار اشرف سلمہا سے اس کی اشاعت کے بارے میں عرض کی تو انہوں نے فوراً اس کی اشاعت کی ذمہ داری قبول کی۔ شبلی نعمانی کے تعارف کے لیے چند سطور میں نے لکھ دیں اور یوں یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ان کا ادارہ پاکستان میں عربی و فارسی کتب کی اشاعت کا اوّلین و قدیم ادارہ ہے اس ادارے نے پہلے بھی نہایت قیمتی کتب شائع کیں ہیں اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ ان کے ادارے کو مزید ترقی عطا فرمائے تاکہ یہ اہلسنّت کی خدمت مزید احسن انداز میں کر سکیں۔ آمین

☆☆☆

فنِ شاعری اور حسّانُ الہند

مصنف
علامہ عبدالستار ہمدانی مصروفؔ
برکاتی نوری

النوریۃ الرضویۃ پبلشنگ کمپنی
لاہور - پاکستان

۷۸۶
۹۲

سوانح شیر بیشۂ سنّت

بنام تاریخی

مُشاہدۂ مولانا حشمت علی

۸۰ ـــــ ھ ـــــ ۱۳

مؤلّفہٗ

محبوبِ ملّت مفتی اہلسنت حضرت مولانا **محمد محبوب علی خان** قادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

النوریۃ الرضویۃ پبلشنگ کمپنی
کچہار شید روڈ بلال گنج لاہور - پاکستان
+92 42 37247702

علمیت روحانیت اور معرفت کا خزینہ

اصل عربی فارسی کتب کا مرکز

شرح فتوح الغیب (فارسی) شیخ عبدالحق محدث دہلوی	الحاوی قدسی القاضی الغزنوی	شرح المواقف (عربی) السید شریف بن ابی محمد الجرجانی	نصب الرایہ (عربی) تخریج احادیث الھدایہ
مدارج النبوۃ (فارسی) شیخ عبدالحق محدث دہلوی	اخبار الاخیار مع مکتوبات (فارسی) شیخ عبدالحق محدث دہلوی	جذب القلوب فی دیار المحبوب (فارسی) شیخ عبدالحق محدث دہلوی	شرح سفر سعادت (فارسی) شیخ عبدالحق محدث دہلوی
المعتمد فی المعتقد ابوعبداللہ فضل اللہ التورپشتی	المسامرہ شرح المسایرہ (عربی) امام ابن ھمام	کیمیائے سعادت (فارسی) امام غزالی	عینی شرح کنز (عربی) علامہ بدرالدین عینی
نادر المعراج (فارسی) شیخ امام کمر آبادی	معارج النبوۃ (فارسی) علامہ معین الدین کاشفی الھروی	مثنوی مولوی معنوی (فارسی) مولائے روم مولانا جلال الدین رومی	کلیات جامی (فارسی) مولانا عبدالرحمن جامی
سبع سنابل (فارسی) علامہ عبدالواحد بلگرامی	بہار باران۔ شرح گلستان علاؤالدین رامپوری	ہشت بہشت (فارسی) دیوان امیر خسرو	شرح عقائد امام غزالی سیدی احمد زروق

اردو کتب

محدثین عظام حیات و خدمات	فن شاعری اور حسان الہند عبدالستار رحمانی مصروف برکاتی	فیصلہ مقدسہ	سوانح شیر بیشہ سنت	الصوارم الہندیہ
مکاشفۃ القلوب (اردو)	شمع شبستان رضا	سامان بخشش	تجلیۃ السلم	مجموعہ نعت (اول)(دوم)
نعت محل اختر الحامدی	منتخب حدیثیں	ذکر حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم	نعت حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم	جماعت اسلامی
ضرورت تقلید	الوظیفۃ الکریمہ اوراد و وظائف اعلیٰحضرت رضی اللہ عنہ	بُرا نہ کہو علامہ سعید احمد کاظمی	کھرا کھری کا مباحثہ	کرامات مفتی اعظم ہند

تقسیم کار۔۔۔ دار النور۔۔۔ دکان نمبر 4 مرکز الاویس دربار مارکیٹ لاہور

النوریہ رضویہ پبلشنگ کمپنی

دار النور

کچہری روڈ بالمقابل گنج لاہور پاکستان

0092-42-37247702, 0300-8539972, 0314-4979792